ضِ میر

مصنفہ

سلطان الشعرا حضرت میر محمد تقی میر

مع مقدمہ و ترجمہ و فرہنگ

مرتبہ

سید مسعود حسن رضوی ادیب

فیضِ میر

مُصنّفہ

سلطان الشعرا حضرت میر محمد تقی میر

مع

مُقدّمہ و ترجمہ و فرہنگ

مرتبہ

سیّد مسعود حسن رضوی ادیب

دوسرا ایڈیشن ... ... چھ سو
ناشر ... ... نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنؤ
طابع ... ... نظامی پریس، لکھنؤ
قیمت ... ... روپیہ

فہرست مضامین

اشاریہ

آدمیوں اور مقاموں کے نام

مقدمہ

اُردو انشا پردازی کے صدرِ مجلس اور ادبی و لسانی تحقیق کے خضرِ طریقت حضرتِ آزادؔ مغفور نے اپنی غیر فانی کتاب آبِ حیات میں معلومات کا وہ انبار لگا دیا ہی جو تنگ نگاہوں میں سما نہیں سکتا، اور اُن کی تحقیق کی وسعت اور جامعیت کا یقین کرنے سے زیادہ آسان یہ معلوم ہونے لگا ہی کہ اُن کے اکثر بیانوں کا من گڑھت افسانوں میں شمار کر لیا جائے۔ کوتاہ نظری اور تنگ خیالی نے ایک ایسی جماعت پیدا کر دی ہی جس نے آزادؔ پر جا بے جا اعتراض کر دینا اپنی وضع میں داخل کر لیا ہی لیکن دور بیں نگاہیں دیکھتی ہیں کہ یہ حالت بہت دنوں تک قائم رہنے والی نہیں ہی۔ ادبی تحقیق کا ذوق اب ہمارے دلوں میں گھر کر رہا ہی اور اپنے ادبی دفینوں کی تلاش میں خاک چھاننے کی دُھن پیدا ہو چلی ہی۔ یہ ذوق ذرا اور پختہ اور یہ دُھن کچھ اور پکی ہو لے اور تحقیق کے راستے کی مصیبتوں اور خطروں کا احساس عام طور پر ہونے لگے تو یہ عارضی آزاد بے زاری بے شبہہ آزاد پرستی میں تبدیل ہو جائے گی۔ اس وقت بھی ادبی تحقیق میں آزادؔ ہی کو یہ مرتبہ حاصل ہی کہ اُن سے اختلاف کرنا محقق ہونے کی سند سمجھا جاتا ہے۔

آزادؔ کے خلاف جو بدظنی پھیل رہی ہی اور پھیلائی جا رہی ہی اُس کا نتیجہ یہ ہی کہ

جہاں آبِ حیات میں کسی ایسی چیز کا ذکر دیکھا جو ہماری دست رس سے دور یا ہمارے علم سے باہر ہی اس کو آزاد کا گڑھا ہوا افسانہ سمجھ لیا۔ آزاد کی تحقیق میں غلطیاں ممکن ہیں اور کسی محقق کو غلطیوں سے مفر نہیں، لیکن جو لوگ تحقیق کی غلطی اور افسانے کی تصنیف کا فرق سمجھتے ہیں، اُن کی نظر میں آزاد محقق ہی ٹھہرتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ آزاد تحقیق کو افسانے سے زیادہ دل چسپ بنا سکتے ہیں۔ انشا پردازی کا یہ کمال اگر کسی اور کے حصّے میں نہ آیا ہو تو آزاد سے نہیں فطرت سے لڑنا چاہیے۔ آزاد کی تحقیق اور انشا پردازی پر مفصل بحث کرنے کا یہ محل تو نہیں ہی لیکن "دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے"۔

میر تقی میر کے بارے میں آزاد کی بہت سی مفروضہ غلط بیانیاں دکھائی جا چکی ہیں[1]۔ انھیں کی تصانیف میں آزاد نے رسالۂ فیض میر کو بھی شمار کیا ہی۔ جس وقت تک یہ رسالہ دُنیا کی نگاہ سے اوجھل تھا اُس وقت تک وہ آزاد کا تصنیف کیا ہوا افسانہ تھا۔ آج یہ رسالہ آپ کے ہاتھ میں ہی۔ اب دیکھیے وہی افسانہ ایک حقیقت بن گیا۔ اسی طرح اَدبی تحقیق جتنی آگے بڑھتی جائے گی آزاد کے افسانے حقیقت بنتے جائیں گے

آزاد نے ہم کو بہت سی راہیں پہلے پہل دکھائی ہیں اور بہت سی کہانیاں پہلے پہل سنائی ہیں۔ اگرچہ بہت سی باتیں آزاد نے ایسی کتابوں سے لی ہیں جو

---

[1] میری ایک کتاب آبحیات کا تنقیدی مطالعہ ۱۹۵۳ء میں شایع ہو چکی ہی، جس میں آزاد کے بیانوں کی صحت اصل ماخذوں کے حوالے سے واضح کی گئی ہی۔

طاقِ نسیاں کے نقش ونگار ہوگئیں یا جن کا ایک آدھ بوسیدہ کرم خوردہ نسخہ دُنیا کے کسی گوشے میں پڑا ہوا ہے، تاہم چوں کہ اُن کو منظرِ عام پر لانے کا سہرا حضرت آزاد کے سر ہی لہٰذا ان باتوں کے علم کے لیے بھی ہم آزاد ہی کے منّت گزار ہیں۔ فیضِ میر کا نام بھی اُنھیں کی بدولت ہم تک پہنچا[۱]۔ مگر آزاد نے اس رسالے کا فقط نام ہی لکھا ہی۔ غالباً یہ رسالہ اُن کی نظر سے نہیں گزرا، ورنہ وہ اُس کے موضوع وغیرہ کا کچھ ذکر ضرور کرتے۔

فیضِ میر کے ذکر سے اکثر تذکرے خالی ہیں۔ البتہ محسنؔ نے میرؔ کی تصنیفوں کی فہرست ان لفظوں میں دی ہی:—

"چھ دیوان ہندی مع قصائد و مثنوی، ایک دیوان فارسی، ایک تذکرہ، ایک رسالہ میر فیض ان سے یادگار رہے[۲]"

مولّف تذکرہ کے قلم کی لغزش ہو یا کاتب کی اصلاح، لیکن اس میں شک نہیں کہ میرِ فیض سے وہی رسالہ مراد ہے جس کا صحیح نام آزاد نے فیضِ میر بتایا ہی۔

ایک زمانہ ہوا کہ اودھ کے شاہی کتب خانوں کی فہرست میں میں نے ذکرِ میرؔ کا نام دیکھا[۳]۔ حضرتِ میرؔ کی خودنوشتہ سوانح عمری کی زیارت کے لیے دل بے چین ہوگیا۔ میں ان دنوں قدیم اور کم یاب کتابوں کی تلاش میں لکھنؤ کی گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ میری آنکھیں ذکرِ میرؔ کو ڈھونڈتی تھیں، لیکن اس کا پتا کہیں نہ لگتا تھا۔

---

[۱] آبِ حیات صفحہ ۲۰۷ [۲] تذکرۂ سراپا سخن صفحہ ۲۶

[۳] فہرست کتب خانہائے اودھ مرتبہ ڈاکٹر اشپرنگر صفحہ ۱۸۲، نمبر ۶۷

طلبِ صادق کی کشش دیکھیے کہ ایک مدّت کے بعد مجھے میرؔ کی غیر مطبوعہ اور نہایت کم یاب تصنیفوں کا ایک مجموعہ ہاتھ آ گیا۔ اس مجموعے میں ذکرِ میرؔ بھی تھی، میرؔ کا فارسی دیوان بھی تھا اور رسالۂ فیضِ میرؔ بھی تھا۔ اس گنجِ بادآورد کے ملتے ہی مجھے خیال ہوا کہ جس گل دستے سے میں نے اپنی آنکھیں روشن کیں ہیں اُس سے اربابِ ذوق کی نگاہوں کی بھی ضیافت کردں۔ ذکرِ میرؔ کی اشاعت طے ہو گئی۔ کاتب تلاش کیا گیا، مقدمہ لکھنے کا سامان ہونے لگا، یہاں تک کہ کتاب کی نقل بھی ختم کے قریب پہنچی۔ لیکن اُس کی اشاعت کی سعادت میری قسمت میں نہ تھی۔ یکایک رسالۂ اُردو نے خبر دی کہ انجمن ترقیِ اُردو عن قریب ذکرِ میرؔ کو شایع کرنے والی ہے[1]۔ غرض کہ میری یہ محنت رائگاں ہوئی اور دل کی ایک اُمنگ بجھ کر رہ گئی۔ مگر میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ ایسا ہو چکا تھا کہ کسی کام کو شروع تو میں نے کیا، لیکن ختم کسی اور نے کر دیا۔ بہر حال ذکرِ میرؔ شایع ہو گئی اور دُنیا نے دیکھ لیا کہ جو قلم اُردو نظم کے میدان میں کوثر اور سلسبیل بہاتا تھا وہ فارسی نثر میں بھی کیا کیا گل کاریاں کرتا ہے۔ نکات الشعرا نے میرؔ کی فارسی انشا پردازی کی سند میں جو محضر پیش کیا تھا اُس پر ذکرِ میرؔ نے ایک مہر اور لگا دی۔

ذکرِ میرؔ کی اشاعت گو میرے ہاتھوں نہیں ہوئی لیکن میرا مقصد تو ایک حد تک پورا ہو ہی گیا۔ اب میرؔ کی بقیہ غیر مطبوعہ کتابوں کی اشاعت کی فکر

---

[1] رسالۂ اُردو بابت اپریل سنہ ۱۹۲۶ء

تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ فیض میر کی اشاعت کا وقت بھی آ گیا۔ میر کی جتنی تصنیفوں کا پتا لگ چکا ہے اُن میں اب صرف دو کا شایع ہونا باقی رہ گیا ہے، ایک میر کا فارسی دیوان[1] دوسرے ایک عشقیہ قصہ[2] فارسی نثر میں۔ یہ وہی قصہ ہے جس کو میر نے اردو نظم کے لباس میں بھی مثنوی دریائے عشق کی صورت میں پیش کیا ہے۔

نکات الشعرا اور ذکر میر دو آئینے ہیں کہ میر کی سوانح نگاری کے جوہر دکھاتے ہیں۔ اگر میر کے قلم کی رفتار تصوّف اور الٰہیات کی دشوار گزار منزلوں میں دیکھنا ہو تو فیض میر پڑھیے۔

فیض میر ایک مختصر رسالہ ہے۔ مصنّف نے نہایت مختصر حمد و نعت کے بعد لکھا ہے :—

"می گوید فقیر حقیر میر محمد تقی متخلص بہ میر کہ درین ایام فیض علی پسر من ذوقِ خواندن ترسل پیدا کردہ بود۔ لذا حکایات خمسہ متضمّن فوائد بسیار را باندک فرصت نگاشتم و مراعات اسم او نمودہ نام نسخہ فیض میر گذاشتم"۔

یہ عبارت بتاتی ہے کہ میر نے یہ رسالہ اپنے بیٹے فیض علی کے لیے لکھا اور اُن کے اور اپنے نام کی رعایت سے اس کا نام فیض میر رکھا۔

میر کے ایک بیٹے میر حسن عسکری عرف میر کلّو عرش لکھنؤ میں رہتے تھے۔ مصحفی نے

---

[1] میر کے فارسی دیوان کا ایک قلمی نسخہ میرے کتب خانے میں موجود ہے۔

[2] یہ قصہ کلیاتِ میر کے بعض قلمی نسخوں میں شامل ہے۔

اُن کا تخلص زار بتایا ہے[1]۔ نساخ کا قول ہے کہ اُن کا تخلص پہلے زار تھا پھر عرش ہوا[2]۔
اُن کے نام سے تو اکثر لوگ واقف ہیں۔ تذکروں میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے۔ اُن
کے شاگردوں میں شیخ محمد جان شاد لکھنوی سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ شاد کو
یہ فخر حاصل تھا کہ اُنھوں نے لڑکپن میں اپنی ایک غزل حضرت میر کو بھی دکھائی
تھی اور اس فخر کے اظہار کے لیے وہ اپنے کو 'پیروِ میر' کہا کرتے تھے۔ یہ طرۂ
افتخار اُن کی دستارِ کمال پر ایسا پھبا کہ آج تک انھیں لفظوں سے اُن کا پتا
دیا جاتا ہے[3]۔

عرش کے بڑے بھائی میر فیض علی فیض کو اتنی شہرت حاصل نہیں ہوئی۔
جو تذکرے میری نظر سے گزرے ہیں اُن میں فیض کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ
ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:—

"میر فیض علی فیض تخلص فرزند اور شاگرد میر محمد تقی کے ہیں۔"

(گلشن سخن۔ مردان علی خاں مبتلا)

"فیض تخلص میر محمد تقی میر کے بیٹے صلاحیت شعار جوان ہیں طبیعت
کی موروثی موزونی کے تقاضے سے کبھی کبھی اپنے خاندان کی وضع پر ارادہ بھی
شعر کہتے ہیں اور اپنے باپ کے غرور کا بھی کچھ حصہ پایا ہے۔"

(تذکرۂ ہندی۔ مصحفی)

---

[1] ریاض الفصحا ص ۱۱۸ — [2] تذکرۂ سخن شعرا ص ۳۲۳

[3] آب بقا ص ۶۳ و ص ۱۰۷، سخن بے مثال (دیوان شاد) دیباچہ

" میر فیض علی فیض پسر میر تقی مرحوم وزیر الممالک کی سرکار میں اپنے باپ کے ساتھ بسر کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ سخن وری کا غرور اُن کو بہت تھا۔ لیکن میری نظر سے اُن کا کوئی شعر ایسا نہیں گزرا جو اُن کے دعوے کا مصداق ہوتا۔ شاید اُن کی نازش باپ کی شاعری کی بنا پر ہو "

(گلشنِ بے خار۔ شیفتہ)

" سخن ور خوش لہجہ، شاعر شیریں زبان .. .. .. خلف الصدق میر تقی تربیت یافتہ اپنے پدر بزرگوار کا تھا "

(خوش معرکۂ زیبا۔ ناصر لکھنوی)

" فیض تخلص، نام میر فیض علی میر محمد تقی کے بیٹے "

(دیوانِ جہاں۔ بینی نرائن جہاں)

" فیض تخلص میر فیض علی خلفِ میر تقی میر مقیم لکھنؤ "

(سخن شعرا۔ نساخ)

مصحفی نے فیض کی چار غزلوں سے چند شعر بھی دیے ہیں جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:—

نہ مانی تو نے میری اپنی ہی ضد بے وفا رکھی — کہیں اب کس سے ہم جا کر ہماری تو نے کیا رکھی

شبِ وصل آئی تھی یارو سو اس بے لطفی سے کاٹی — ہمارے اپنے اُن نے درمیاں تلوار لا رکھی

کدورت جب تب اندازے سے نکلا ہی کی تیرے — ہماری خاک اُس کوچے میں تو نے کب صبا رکھی

ل فرماں روائے اودھ

بنائے صانعِ قدرت نے کیا کیا پھول گُل یوں تو ۔ مرے اُس گُل بدن میں کچھ ادا سب سے جدا رکھی

دور میں ساقی ترے آ نکلے ہیں مے نوش ہم ۔ جام خالی دے ہے کیا اتنے نہیں مدہوش ہم
سر فرو لاتے نہیں ژولیدہ مویانِ عشق کے ۔ سایۂ بالِ ہما پر ماریں ہیں پاپوش ہم
بے زبانی کی نہ پوچھو وجہ ہم سے کوفت میں ۔ چوٹ کچھ ایسی لگی دل پر کہ ہیں خاموش ہم
شوق میں تیرے کنار و بوس کے اے بحرِ حسن ۔ موج کے مانند ہو جاتے ہیں سب آغوش ہم
دل نہیں رہتا کہ چھپ کر دیکھ لیں ہیں ورنہ فیض ۔ عمر گزری ناکسی سے اپنی ہیں روپوش ہم

ہوئیں

گُل کھا موئے جنھوں کے لیے جسمِ زار پر ۔ دو پھول بھی نہ لائے کبھی وہ مزار پر
یاری کی مت اُمید رکھا کر رقیب سے ۔ اک میں ہی ناتواں ہوں بھاری ہزار پر
کیا کیا طیور آکے سرِ تیر پھر گئے ۔ کچھ اِن دنوں نہیں ہے ترا دل شکار پر
یہ فیض ساری صورتیں ہیں مٹنے والیاں ۔ مت بھول آہ یہاں کے تو نقش و نگار پر

---

[۵] روش بھائی ہے کیا ان خوب صورت گل عذاروں کو ۔ لیے آئینہ دیکھا کرتے ہیں اپنی بہاروں کو
نہیں معلوم کس رشکِ قمر کی راہ تکتے ہیں ۔ کہ ساری رات آنکھوں میں کٹا کرتی ہے تاروں کو
خدا جانے کہ تجھ سے فیض کیا اس کو ہے بیزاری ۔ جہاں دیکھا تجھے اُس نے پکارا اپنے یاروں کو

---

[۵] یہ تین شعر تذکرۂ ہندی کے مطبوعہ نسخے میں نہیں ہیں مگر ایک قلمی نسخے میں موجود ہیں جو مدرسۂ ندوۃ العلما، لکھنؤ کے کتب خانے میں ہے۔

گلشنِ سخن اور سخن شعرا میں دو دو شعر ان کے علاوہ ہیں جو ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں:۔

کبھی اُس زلف سے ٹک لگ چلے ہوں تو کہیں تم بھی ۔۔۔ دل پر آرزو رکھتے ہیں یونہیں مار مار اپنا

دن رات آگ ہی میں دل کو لٹا رہے ہیں ۔۔۔ داغِ فراق اُس کے چھاتی جلا رہے ہیں

کہہ دیا سب سے جو کہ تھا معلوم ۔۔۔ دل ترا حوصلہ ہوا معلوم

یہ ترکِ چشم تمہارے مست ہیں جواں دونوں ۔۔۔ کہ سو رہے ہیں تلے سر کے رکھ کماں دونوں

میر کے دو بیٹے تو شاعر تھے ہی، اگر تذکرۂ شمیمِ سخن کی روایت صحیح ہے تو میر کی ایک بیٹی بھی صاحبِ دیوان شاعرہ تھیں اور بیگم تخلص کرتی تھیں[1]۔

میر کی عبارت جو اوپر نقل کی گئی ہے اُس سے معلوم ہو چکا ہے کہ رسالۂ فیضِ میر میں پانچ حکایتیں بیان کی گئی ہیں۔ لیکن یہاں حکایت سے مراد نہ بادشاہوں اور وزیروں کے قصّے ہیں نہ دیووں اور پریوں کی کہانیاں۔ ان حکایتوں میں میر نے اللہ والوں کے حالات اور پیروں کی کرامات بیان کی ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ سُنی سُنائی نہیں آنکھوں دیکھی باتیں ہیں۔ یہ واقعات ہوں یا میر کی خوش اعتقادی کے کرشمے، بہر حال ان کی روشنی میں میر کی ذہنیت صاف نظر آتی ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ شاعروں کے پیر[2] حضرت میر ایک فقیر منش بزرگ تھے، صوفی درویشوں سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، اُن کی خدمت کو

---

[1] شمیمِ سخن ص ۲۷ [2] میر خود کہتے ہیں "گرچہ ہوں میں نوجواں پر شاعروں کا پیر ہوں۔"

اپنی عزت اور اُن کی دل جوئی کو فرضِ انسانیت سمجھتے تھے! اُن کو خدا رسیدہ جانتے اور صاحبِ کرامات مانتے تھے۔ تصوّف اور الٰہیات کے مسائل سے میر کو بڑی دل چسپی تھی۔ وہ اُن کو غور سے سُنتے تھے اور سمجھنے اور یاد رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ جس کی تربیت میر علی متقی اور میر امان اللہ کی گود میں ہوئی ہو، اس کی طبیعت کا انداز اور کیا ہوتا۔

میر کی شاعری کو بہ خوبی سمجھنا ہو تو میر کو سمجھیے۔ اور میر کو سمجھنا ہو تو ذکر میر اور فیض میر پڑھیے۔ حقیقت یہ ہے کہ میر کے کلام کی تہہ کو پہنچنے کے لیے ان دونوں کتابوں کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ ذکرِ میر اگر میر کے ماحول کا صحیح نقشہ ہے تو فیض میر اُن کی سیرت کی سچی تصویر ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب سے صوفیوں کا اندازِ طبیعت، پروازِ خیال اور طرزِ کلام بھی خوب سمجھ میں آتا ہے۔ اس لیے عشقِ حقیقی کے معاملات اور تصوّف کے خیالات جو ہماری شاعری کو زینت دیتے ہیں، اُن کے ذہن نشین کرنے میں بھی اس رسالے سے بہت مدد ملے گی۔

میر کی معاشرت، حالاتِ زندگی اور تعلقاتِ خاندانی کے بارے میں اس رسالے سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ میر کے یہاں ایک غلام اور ایک بوڑھی خادمہ تھی، مُنہ ہاتھ دھونے کے لیے طشت اور آفتابہ استعمال کرتے تھے، شہ سواری جانتے تھے، مگر گھر میں گھوڑا نہ تھا، اکبر آباد کو چھوڑ کر دہلی میں رہنا شاق تھا، اُن کے ایک بیٹے فیض علی فیض تھے اور ایک عزیز محمد حسین کلیم تھے جو

۱؎ ذکر میر ص ۲۰

اسحٰق خاں شہید کے چھوٹے بھائی مرزا محمد علی کے یہاں پچاس روپے ماہوار پر نوکر تھے۔

انھیں محمد حسین کلیم کے بارے میں میر نے نکات الشعرا میں لکھا ہے کہ شاہ جہاں آباد کے رہنے والے ہیں، سپاہی پیشہ آدمی اور ریختے کے زبردست شاعر ہیں، صاحب دیوان ہیں، قصیدے، مخمس اور رباعیاں بھی کہی ہیں۔ ان کا طرز کسی کے طرز سے نہیں ملتا ہے لیکن اکثر مرزا بیدل کی زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ ان کے تہہ دار شعروں کے سمجھنے میں فہم عاجز ہے۔ ان کی طبع رواں سیلاب کی روانی رکھتی ہے اور ان کی فکر رسا آسمان کے اس پار نکل جاتی ہے۔ فارسی میں ایک کلیم گزرا ہے، لیکن فقیر کے نزدیک کلیم ریختہ یہ ہیں۔ بندے کو ان کی خدمت میں جو قرابت قریب حاصل ہے اس سے قطع نظر اُن کے ساتھ ایک دلی خلوص رکھتا ہوں۔ اکثر اس ہیچ مدان کے حال پر شفقت فرماتے ہیں۔ خدا ان کو سلامت رکھے[۱]۔

میر کے اس بیان سے یہ نہ معلوم ہوا کہ اُن میں اور کلیم میں کیا قرابت تھی۔ میر حسن نے کلیم کو دیکھا تھا۔ لکھتے ہیں کہ جوانِ محمد شاہی گندم گوں، دراز قد تھے، میر سے قرابت قریبہ رکھتے تھے۔ مرزا لطف نے بھی کلیم کو میر کے قرابتیوں میں لکھا ہے، لیکن ان کا رشتہ نہیں بتایا ہے۔ شیفتہ نے کلیم کو میر کا بہنوئی اور اُن کے بیٹے میر محمد حسن عرف میر حاجی تجلی کو میر کا خواہر زادہ لکھا ہے[۲]۔ تذکرہ سراپا سخن کے مؤلف محسن نے بھی تجلی کو میر کا خواہر زادہ بتایا ہے[۳]۔ لیکن کلیم کے دوسرے بیٹے میر محمد محسن محسن کو

۱۔ نکات الشعرا ص ۴۵ ۲۔ گلشن بیخار ص ۲۰۰ ۳۔ سراپا سخن ص ۲۱۵

میر کا برادر زادہ لکھا ہی[۵۱]۔ حسن اور شیفتہ نے بھی محسن کو میر کا برادر زادہ بتایا ہی، لیکن کلیم کا بیٹا نہیں لکھا[۵۲]۔ محسن کے نام میں ان دونوں کے یہاں کچھ اختلاف ہی۔ حسن نے ان کا نام "شیخ محمد محسن" اور شیفتہ نے "میر محسن" لکھا ہی۔

محمد حسین کلیم کے بارے میں مختلف تذکروں سے جو کچھ معلوم ہو سکا وہ یہ ہی کہ مسلم الثبوت شعرا میں شمار کیے جاتے تھے، فارسی اور اُردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، نثر اور نظم دونوں پر قدرت رکھتے تھے۔ اُنھوں نے شیخ محی الدین ابن عربی کی کتاب فصوص الحکم کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا، ایک رسالہ یا بقولِ قائمؔ کئی رسالے عروض و قافیے پر لکھے تھے۔ ایک دیوان اور چند مثنویاں بھی اُن کی تصنیف سے تھیں۔ ان کے قصیدوں اور غزلوں کے اشعار کی تعداد بیس ہزار کے قریب تھی۔ آدمی قابل تھے، علم عروض اور فنِ شعر کے ماہر تھے، لیکن کلام بے نمک اور مشکل تھا اس لیے مشہور نہ ہوا۔ محسن لکھتے ہیں کہ کلیم میر تقی میر کے شاگرد تھے اور اُنھوں نے ابنِ عربی کے اکثر رسالوں کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ لیکن اُن کا یہ قول صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ قائمؔ کا بیان تو یہ ہی کہ "فصوص" کا ترجمہ اُردو نظم میں کر رہے تھے، لیکن بعض عوارض کے سبب سے اس کام کو ترک کر دیا۔ میر حسن نے اُن کی اُردو نثر کی ایک کتاب سے ذیل کے چند جملے بھی نقل کیے ہیں جو بادشاہ احمد شاہ کے نابینا ہو جانے کے متعلق لکھے گئے تھے:—

"کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر، آج کے دن ہو بیٹھے ہیں اندھے

---

۵۱ سراپا سخن ص ۹۲ ۵۲ تذکرہ میر حسن ص ۱۷۳، گلشن بیخار ص ۱۷۲

ہو بصیر۔ ایسی دولت سے زینہار زینہار، فاعتبروا یا اولی الابصار۔"

میر حسن نے کلیم کو "شاعر زبردست و مشاق قدیم"۔ قائم نے "پہلوانِ میدانِ سخن"۔ لطف نے "کلیم طور سخن دانی" اور شیفتہ نے "کلیم طورِ معنی پروری مسیح معجزۂ سخن وری" لکھا ہے۔ کلیم کی تاریخِ وفات کسی تذکرے میں نہیں ملی۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ فیض میر اور نکات الشعرا کی تصنیف کے وقت زندہ تھے لیکن میر کی زندگی ہی میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔

میر نے نکات الشعرا میں کلیم کے بہت سے شعر دیے ہیں۔ اُن میں سے چند یہاں نقل کیے جاتے ہیں:—

آتی ہے دل پہ قلقلِ مینا سے اب شکست — وہ دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا

درازیِ شبِ ہجران و زلفِ یار، کلیم — تو مجھ سے پوچھ کہ کاٹی ہے رات آنکھوں میں

تجھے برق خار سے کام کیا جو حیا ہے حق کو تلف کر — یہ ازل کے دن سے نصیب ہے کفِ پائے آبلہ دار کا

اب دم شمردگی سے مجھے کاروبار ہے — ہر دم مرے حساب سے روزِ شمار ہے

محمد حسین کلیم کا حال ذیل کی کتابوں میں دیکھیے:—

(۱) نکات الشعرا ص۴۵، (۲) فیض میر ص۷۸، (۳) تذکرہ میر حسن ص۱۶۳

(۴) گلشن ہند ص۱۴۵، (۵) سراپا سخن ص۱۰۵، (۶) گلشن بیخار ص۱۹۳، (۷) مخزن نکات ص۳۵

غزد و حسن ؔ کو نہیں کسی کی داد کو پہنچے
غرض تم سُن چکے احوال ہم فریاد کو پہنچے

میرؔ کو فارسی زبان پر جو عبور تھا اور فارسی نثر لکھنے کی جو قدرت تھی وہ اُن لوگوں سے پوشیدہ نہیں ہے جنھوں نے میرؔ کی خود نوشتہ سوانح عمری ذکر میر اور اُن کا تذکرہ نکات الشعرا دیکھا ہے۔ میرؔ کے ہم عصر بھی اُن کی نثر نگاری کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ میر حسنؔ نے اُن کی نظم کے ساتھ نثر کی بھی تعریف کی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"چراغ نثرش روشن وساخت نظمش گلشن"[1]۔

میرؔ بالعموم مقفیٰ عبارت لکھتے ہیں۔ لیکن قافیے کے التزام سے عبارت کی شگفتگی، بے ساختگی اور روانی میں فرق نہیں آتا۔ قافیے کے التزام سے شاید کہیں کہیں کچھ تصنّع پیدا ہو گیا ہو، لیکن زیادہ تر عبارت کا حُسن بڑھ جاتا ہے۔ ہم قافیہ فقروں اور جملوں کی قید سے عبارت میں اکثر یہ نقص پیدا ہو جاتا ہے کہ ہر فقرے اور جملے کے بعد جو دوسرا جوابی فقرہ یا جملہ آتا ہے اُس میں کبھی پہلے فقرے یا جملے کے مفہوم کی بے جا تکرار ہوتی ہے اور کبھی بے ضرورت لفظوں کی بھرتی ہوتی ہے۔ اس سے عبارت میں تصنّع، طوالت اور سُستی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن میرؔ کے یہاں یہ نقص نہیں ہے۔ اُن کے یہاں جوابی فقرے اور جملے بھی چُست ہوتے ہیں اور اپنا مفہوم علیٰحدہ رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ جس عبارت میں بڑے بڑے جملوں کے آخر میں قافیہ لایا جاتا ہے، وہ اکثر بے لطف معلوم ہوتی ہے۔ لیکن میرؔ کے یہاں

---

[1] تذکرہ میر حسن ص ۱۷۵

چھوٹے چھوٹے جملوں بلکہ دو لفظی اور سہ لفظی فقروں کے بعد قافیہ آتا ہے تو عجب بہار دکھاتا ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں :—

"پسر او در اخون بگیرد، خودش بخواری بمیرد - ناگہاں آتش در اُفتد، رسم باشش و بود بر اُفتد - از من آثار نماند، این جا دیّار نماند - آبادی غیرت وادی شود، مار بہ عصا راہ رود - مردمان تباہ، خانہا سیاہ، ازین سر تا بہ آن سر ویرانہ، این با ہم نشستہا افسانہ - محلہ را آب برد، این جا تو نہ پرد۔"

"آن سرمایۂ جانہا کہ مقصود دلہاست آئینۂ در پیش دارد، و سرے با خویش - گرم تماشائے خود است، و محوِ سراپائے خود - اگر بر آسمانِ ہفتم روی بے پرواست، و ز خاک شوی ہمان گرم استغنا - بے رنگی او رنگہا داد، و ساز دہد نقش آہنگہا شفق یاد می دہد از رنگ آلش، گل می گوید کہ گل بہ جمالش۔"

"ز میدی از برائے چہ، مقصود ہم کنار است - دل تنگ چرا نشستۂ کہ عالم ہمہ یار است - برخیز و سیاحت کن، خوش باش و فراغت کن - برخاستم، ہم راہ شدم - آگاہے بود آگاہ شدم۔"

"خدا طرز خود آرا است، غریب دل بر خود نماست - گرد راہش قیامت انگیزد، طرز خرامش بلاہا ریزد - کار او ہیچ بہ فہم در نیاید، دانش

اعتراف بہ عجز می نماید۔ حیران کار خرد مند، در عجب وقت پسند۔ او سرگرم کار، فکر در آزار۔ آگاہ ناگاہ، دلیل گم راہ۔ ادراک و فہم، این جا ہمہ وہم"

میر اپنی نثر میں عام طور پر قافیے کا التزام کرتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ قافیے کی تلاش میں مطلب کی راہ بھول جائیں۔ اور نہ یہی ہے کہ بغیر قافیے کے قدم آگے نہ بڑھائیں۔ ایسے جملے اور فقرے بہ کثرت ہیں جن کے جوابی جملے اور فقرے نہیں لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ کہیں کہیں دُور تک نثر عاری لکھتے چلے گئے ہیں مثلاً :—

" با آن کہ محو یاد الٰہی می بود اما ربط درستے بہ شعر و شاعری داشت۔ یکے دم صبح مرا خواست۔ چون حاضر شدم گفت کہ خفقان بہ شدت دارم۔ واشدے نمی شود۔ شعرہائے عاشقانہ بخوان، کہ زار بگریم۔ اتفاقاً این شعر از زبان من بر آمد

صبر بہ پیش دل تو شکیبِ من ناخوش — کہ از برائے پیدن بہانہ می طلبد

دست بر دل نہاد و غش کرد۔ مردمان بر دو دستش بر داشتہ اندرون خانہ بردند۔ از آن بعد بیرون نیامد۔ دو سہ روز حال عجیبے داشت، گاہے غش و گاہے افاقت۔ آخر در گذشت۔ خدائے کریمش بیامرزاد "

توصیفی فقروں کے بنانے میں میر کو بڑا کمال تھا۔ وہ جب کسی کے اوصاف بیان کرنے پر آتے ہیں تو چھوٹے چھوٹے فقرے پے در پے لکھتے چلے جاتے ہیں۔ ذیل کی مثالیں ملاحظہ ہوں :—

"اسدِ دیوانہ، ساکنِ ویرانہ، سالکِ مجذوب، درویشِ خوب، رندِ بوریا پوش، چوں بحر در جوش۔"

"مردے بود کامل، ہمہ تن دست و دل، بالا بلند، دقّت پسند، گرم جوش، سراپا ہوش، چسپاں اختلاط، خوش ارتباط، وضع مربوط، حال مضبوط، دل بایار، دست در کار، قائم اللیل، صائم النہار ... ... رو از دُنیا بر تافتہ، عارف قرار یافتہ ... ... چادر بر دوش، بایک ستر پوش، پا بے کفش، سر عریاں، گاہے خنداں، گاہے گریاں۔"

"دلیلِ راہِ عرفان، میاں شاہ برہان، دست از دنیا برداشتہ، قدم براہ فنا گزاشتہ، آوارۂ بہ منزل رسیدہ، بہ گلیم سیہ سر درکشیدہ، سفید گود برہنہ تن، با معنی دریک پیراہن۔"

میر کو فلسفۂ الٰہیات کے مسائل سے دلچسپی تو تھی ہی، وہ اُن کو بڑی خوبی سے بیان بھی کر سکتے تھے، جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہے:—

"لذّت دریافتن چیزے ملائم است والم دریافتن چیزے منافی آں۔ ہر قوت را از قوتہا مدرکات لذّت والم است بہ حسب آں قوت۔ چناں کہ لذّتِ باصرہ در دیدنِ محبوب ولذّتِ سامعہ در سمع آوازِ خوب۔ چنداں کہ مدرک بہ عظیم تر لذّتِ قوی تر۔ وگر از اضداد است رنج والم زیاد است۔ چون ہیچ

مدرک شریف تر از ذات وصفات واجب الوجود نیست پس ہیچ لذّتے لذیز تر از معرفتِ او نہ باشد۔ و قوّت ہائے جسمانی با ابدان می روند یعنی از فنائے آن باطل می شوند۔ قوتِ عقلی کہ لذّت والم را می داند با نفس ناطقہ باقی می ماند۔ ادراکِ نفس متعلق بہ بدن قاصر و مجرد در مشاہدۂ جمالِ او ناظر۔"

"در اثباتِ بعث وحشر دلائل بسیار است، امّا عودِ نفس بہمان بدن دشوار است۔ مثلا مثلاً آدمی مُرد و خاکش ہمہ خورد۔ و پس از روزگارِ طویل اجزائے ارضی بہ نبات مستحیل۔ نبات غذائے حیوان شد و حیوان غذائے انسان۔ اگر ہمت بہ حشر برگمارند بہ کدام صورت باز آرند۔ مع ہذا نفوس مفارقہ را غایت نیست وابدان و مادہ را نہایت۔ اگر حشر کنند و بہ قسمتِ مواد گرایند نفوس از مواد البتہ بیش تر آیند۔ ... ... حقیقتِ جانِ آدم قدیم است بہ ذاتِ خویشتن وگفتگوئے قالب در این جا بر قالب زدن۔ گمان مبر کہ معنیِ مرگ نیستیِ جانِ عزیز است۔ این انقطاعِ تصرفِ او از قالب ناچیز است۔ معنیِ بعث وحشر نہ آن باشد کہ جان را قالب ہمان باشد۔ قالب مرکبے بیش نیست، از بدلِ آن چہ زیان است۔ ردّ و بدل با سوار است، سوار خود ہمان است۔"

"بہشت و دوزخ کہ قالب در آن شریک است متعارف است۔ حاصل یکے حور و قصور و انہار و اشجار، حاصل دیگرے زہر و زقوم و نار و مار۔

امّا بہشت و دوزخ روحانی یعنی لذّت و الم جانی، حاصل آن دریافت معقولات و مشاہدۂ آں ماہِ تمام۔ حاصل این شرم خجالت و سوختگی و الآم۔ حکما می گویند کہ نفس را بعد موت لذّت عظیمے است کہ لب بتوصیف او نتواں کشاد، یا الم ایسے است کہ شرح آن نتوان داد۔ اشارت بہ ہمیں دو حال است نفوسِ کاملہ را لذّتِ دوام، ناقصہ را رنج و الم مدام"۔

میرؔ کے قبضے میں فارسی لفظوں اور محاوروں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ اُن کے استعمال پر اُن کو جو غیر معمولی قدرت حاصل ہے اُس کے ثبوت میں کوئی مثال پیش کرنا ضروری نہیں معلوم ہوتا ہے۔ کتاب کا ہر صفحہ اس پر شہادت دے رہا ہے۔

فیضِ میرؔ کا زمانۂ تصنیف نہیں معلوم ہو سکا۔ اتنا پتا تو چلتا ہے کہ میرؔ نے یہ رسالہ دہلی میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے بعد، میر محمد حسین کلیم کی زندگی میں، اور میاں سید خاں کے انتقال کے بعد لکھا۔ لیکن کلیم اور سید خاں کے انتقال کی تاریخ بھی معلوم نہیں، ورنہ اس رسالے کی تصنیف کا زمانہ معین کرنے میں کچھ مدد ملتی۔

رسالۂ فیضِ میرؔ کا جو نسخہ میرے کتب خانے میں ہے، وہ بدخط بھی ہے اور کرم خوردہ بھی۔ اُس کے پڑھنے میں پوری کوشش کی گئی، پھر بھی بعض لفظ مشتبہ رہ گئے۔ جی چاہتا تھا کہ اگر اس رسالے کا کوئی دوسرا نسخہ مل جائے تو اُس سے مقابلہ کر کے مشتبہ مقامات کی تصحیح کر لی جائے۔ خدا خدا کر کے پتا لگا کہ رام پور میں ایک صاحب کے پاس یہ رسالہ موجود ہے۔ کامیابی کی یہ صورت جو نظر آئی تو میرا شوق

مجھ کو رام پور کھینچ لے گیا۔ لیکن انتہائی کوششوں پر بھی رسالے کا مقابلہ ممکن نہ ہوا۔ مقابلے کا کیا ذکر مالکِ رسالہ نے واقف حال لوگوں کو اپنا نام تبانے کی بھی اجازت نہیں دی۔ بہر حال میں پروفیسر سید محمد نقی صاحب شاد ماں لکھنوی اور مولوی عزیز اللہ خاں صاحب مدیر ماہ نامۂ نیرنگ کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس معاملے میں کافی کوشش کی، اور مالکِ رسالہ کا بھی کہ ان کے طرزِ عمل کی بہ دولت انسانی فطرت کا ایک نیا پہلو پیش نظر ہو گیا۔ اب اس کتاب میں جو غلطیاں ملیں ان کا ذمہ دار قارئین کرام مجھ کو نہیں، بلکہ انھیں رام پوری حضرت کو قرار دیں، جنھوں نے مجھ کو ان غلطیوں کی تصحیح کا موقع نہ دیا کسی نے خوب کہا ہے

خدا جزا دے بہ آنان دہد کہ چارۂ دل

بہ یک نگاہ نہ کردند و می توانستند

فیض میر فارسی میں ہے اور فارسی بھی ایسی جس کا سمجھنا بہت آسان نہیں ہے۔ اس لیے کتاب کی نفع رسانی کا دائرہ وسیع کرنے کی غرض سے اس کا خلاصہ اردو میں لکھا جاتا ہے۔ یہ خلاصہ کیا ہے کتاب کا آزاد ترجمہ ہے، جس میں کہیں کہیں ایسے فقرے اور جملے چھوڑ دیے گئے ہیں جو صرف تزئینِ کلام کا فائدہ دیتے ہیں۔

پہلی حکایت

ایک دن میں ایک مشہور درویش سے ملا، جس کا نام شاہ ساہا تھا اور جو دن رات استغراق کے عالم میں رہا کرتا تھا۔ وہ بڑی مہربانی سے پیش آیا اور کہنے لگا کہ تم اس قدر پریشاں حال کیوں ہو۔ اگر تمھارے دل کو اس سراپا ناز

ے تعلق ہے، تو خود اپنے آپ پر نظر رکھو۔ کیوں کہ باوجود اس تنزّہ اور تقدّس کے وہ ایسا تعلق رکھتا ہے کہ اس میں اور تم میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ گو کہ وہ کمالِ ظہورِ حُسن کی وجہ سے آفتابِ نصف النہار کی طرح حجاب میں ہے، لیکن دُنیا کا کوئی ذرّہ اُس کے پَرتَو سے محروم نہیں ہے۔ غور کرو اور اپنی حقیقت کو سمجھو۔ تم خود ہی اپنا مقصود ہو۔

شام کے وقت مشکیزہ کندھے پر رکھے ہوئے بازار میں آتا تھا اور آواز دیتا تھا کہ اے ہستی کے کم آب دریا کے ساحل پر پیاسے رہنے والو! اگر تم میں سے کوئی اپنے لب تر کرنا چاہتا ہو، تو آئے۔ جب لوگ اُس کے گرد جمع ہو جاتے تھے تو کسی کو دُودھ اور کسی کو شکر کا شربت پلاتا تھا۔

ایک دفعہ پہر رات گئے مجھ سے کہنے لگا کہیں سے جَو کی روٹی ملتی تو میں سیر ہو کر کھاتا۔ مَیں اپنے گھر آیا۔ سب لوگ سو گئے تھے، سوا ایک بوڑھی خادمہ کے جو کروٹیں بدل رہی تھی۔ اُس سے روٹی مانگی۔ اُس نے بہت چِزبِز ہو کر روٹی ٹپکا دی۔ جب میں وہ روٹی اُس درویش کے پاس لے گیا تو وہ کہنے لگا کہ یہ آدمی کے کھانے کے قابل نہیں ہے۔ اس پر ایک کتیا بھونکی ہے۔ اِسے لے جاؤ اور کتّوں کے آگے ڈال دو۔ غرض کہ اُس نے وہ روٹی کسی طرح نہ کھائی اور مجھے اِس بات پر بڑی حیرت ہوئی۔

ایک بوڑھی تیلن اس کی معتقد تھی۔ اکثر اس کے یہاں ایک ٹکڑا روٹی کھا لیتا اور ایک گھونٹ پانی پی لیتا تھا۔ ایک دفعہ اُس فقیر پر یہ حالت طاری ہوئی کہ بند بند سے جدا، اور سر ہوا میں معلّق۔ بڑھیا یہ دیکھ کر چیخنے لگی کہ اے محلّے والو! کسی نے میاں

ساہا کو قتل کر ڈالا۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس شور و غوغا سے درویش اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھ زمین پر پٹکنا اور نفرین کرنا شروع کیا کہ جس کسی نے میرا یہ راز فاش کیا ہے اُس کا لڑکا آج ہی رات کو قتل ہو جائے، وہ خود ذلّت کی موت مرے، ناگہاں آگ لگ جائے، میرا نشان نہ رہے، یہاں آدمی کا نام نہ رہے، آبادی ویرانہ ہو جائے، ایک سانپ کا اِدھر سے گزر ہو، آدمی تباہ اور گھر سیاہ ہو جائیں، یہ محلّہ بہہ جائے اور یہاں ایک چڑیا تک نہ دکھائی دے۔

اتنے میں دن ختم کے قریب پہنچا۔ درویش نے مُنھ ہاتھ دھو کر نماز پڑھی اور مجھ سے مہربانی سے کہا کہ اے عزیز! آج شام سے پہلے ہی چلا جا۔ فقیر کے لیے تشویش کا سبب نہ بن۔ مجھے دکھائی دے رہا ہے کہ یہ محلّہ نزولِ حادثات کا محل ہے۔ قریب ہے کہ عافیت یہاں سے رخصت ہو اور مصیبت نازل ہو۔

رات کو کوئی دو سو چور تلواریں لیے ہوئے آئے اور اُن میں سے دو تین آدمی کمندیں ڈال کر بڑھیا کے کوٹھے پر پہنچے۔ اُس کا بیٹا اُن سے مقابل ہوا مگر تلوار کے ایک ہی وار میں ختم ہو گیا۔ چوروں نے گھروں میں آگ لگا دی اور اطمینان سے لوٹ مار کر چل دیے۔ لوگوں نے ڈر کے مارے محلّہ چھوڑ دیا۔ مگر ابھی کوئی پناہ کی جگہ بھی نہ ملی تھی کہ دفعتہً کالی گھٹا چھا گئی اور ٹوٹ ٹوٹ کر برسنے لگی۔ اس کو ایک پہر بھی نہ گزرا تھا کہ پانی کا ایک سمندر اُمنڈتا ہوا جنگل کی طرف سے شہر میں آیا اور مکانوں کو بہالے گیا۔ جب سیلاب دُور ہوا تو عمارتوں کا نشان بھی نہ تھا۔ وہ محلّہ کفِ دست میدان ہو گیا تھا۔

میں حیران و پریشان فقیر کے تکیے کی طرف چلا۔ راستے میں میری نگاہ اُس بڑھیا

پر پڑی۔ میں نے اُس سے حال پوچھا۔ اُس نے کہا کہ تفصیل کیا بیان کروں۔ فقیر کی نفرین نے یہ حال کیا ہے۔ اگر اُس سے ملاقات ہو تو کہنا کہ میں اپنی سزا کو پہنچ چکی۔ اب دعا کرو کہ موت میری مشکلیں آسان کر دے۔ میں نے کہا اطمینان رکھو۔ اگر موقع ملا تو تمہارا پیغام اُس تک پہنچا دوں گا۔

ابھی کوئی ایک تیر کے پلّے پر پہنچا ہوں گا کہ راستے میں ایک کالا سانپ آندھی کی طرح چلا آ رہا تھا۔ میں سڑک سے ہٹ گیا اور بالا بالا فقیر کے تکیے پر پہنچا۔ دیکھا کہ فقیر جامۂ ببری پہنے شیر کی کھال پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی ہیبت ناک ہیئت نے مجھ پر یہ اثر کیا کہ میرے پاؤں کانپنے لگے۔ اُس کی آنکھوں سے گویا چنگاریاں نکل رہی تھیں، اور وہ ہر طرف ایسی نگاہ سے دیکھتا تھا کہ دیکھنے والے کا پتّا پانی ہوتا تھا۔ مجھ سے پوچھا کہ کہاں سے آتے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ میں اُس تازے ویرانے کو دیکھنے کو گیا تھا۔ اُس بڑھیا سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ سُن کر اُس نے منھ بنایا اور کہا کہ فضول نہ بکو۔ ایک سانپ گیا ہی جو اُس کا کام تمام کر دے گا۔ گھڑی بھر کے بعد خبر آئی کہ بڑھیا تیلن کو سانپ نے کاٹ لیا۔ میں اس واقعے سے حیران ہوا اور خاموش رہ گیا۔ کہنے لگا کہ تم کھو کیوں گئے۔ آج رات کو وہی سانپ مجھ روسیاہ کو بھی کاٹے گا۔ میں اور بھی زیادہ حیران ہوا۔ اُس نے کہا کہ فقیر کے غصّے کی آگ جب بھڑک اُٹھتی ہے تو خشک و تر سب کو جلا ڈالتی ہے۔ اب میری زندگی کا وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ دو تین باتیں کہتا ہوں، سُنو اور یاد رکھو۔ یہ دُنیا ایک دل کش کارواں گاہ ہے۔ یہاں سے حسرت کے سوا کچھ ساتھ نہیں جاتا۔ افسوس ہے اُس شخص کی اوقات پر کہ جو جلد

آگاہ نہیں ہوتا۔ شیرانہ زندگی بسر کرو اور آخرت کی فکر کرو۔ وقت جو بھاگا جا رہا ہے اُس کو ضایع نہ کرو۔ افلاطون باوجود اُس کمال کے مسافروں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا اور گھڑی گھڑی روتا تھا۔ ایک شاگرد نے اس کا سبب پوچھا۔ اُس نے جواب دیا کہ موت کا مرحلہ جس کو درپیش ہو وہ کیوں کر نہ روئے۔ سمجھ لو کہ وہ سرمایۂ جان جو دلوں کا مقصد ہے، اپنے دیدار میں مصروف اور اپنے سراپا میں محو ہے۔ اگر ساتویں آسمان پر پہنچ جاؤ تو بھی بے پروا ہے! اور اگر خاک ہو جاؤ تو بھی مستغنی ہے۔ اُس کی بے رنگی میں رنگ ہیں اور اُس کے سازِ وحدت میں آہنگ ہیں۔ وہ پردہ کثرت میں نوا سازی کرتا ہے، شش جہت سے اُس کی آواز آتی ہے۔ موت کا ذکر کرتے رہو اور قبرستان میں جایا کرو، تاکہ اپنے جانے سے غافل نہ رہو اور طفلانہ کھیل کی طرف مائل نہ ہو۔ جاؤ اب شام ہوئی۔ مجھ کو بھی چلنے کی فکر ہے۔ اُمید ہے کہ صبح کو میرے جنازے پر آؤ گے اور مدّت کی صحبت کا حق بھول نہ جاؤ گے۔ تکرار کی مجال نہ تھی، میں ناامید اُٹھ کھڑا ہوا۔ غم کی شدت سے کچھ کھایا بھی نہ گیا، ساری رات بے قراری میں بسر کی۔

ابھی صبح بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اک شور اُٹھا کہ شاہ صاحب کو سانپ نے کاٹا اور اُس کا کام تمام ہو گیا۔ دل قابو سے نکل گیا، پیروں کی طاقت نے جواب دے دیا۔ ایک دوست کے گھر سے گھوڑا منگوایا اور اُس پر سوار ہو کر وہاں پہنچا۔ فقیر کے جنازے کی نماز میں شریک ہوا۔ اُس کی میّت اُسی تازہ ویرانے میں خاک کے سپرد کر دی گئی۔ کیا لکھوں کہ اُس فقیر کی موت کا کتنا غم ہوا۔ مہینوں میرا سینہ جلا کیا اور برسوں اُس کا خیال میرے دل سے نہ گیا۔

دوسری حکایت

میں نے سُنا کہ ممتاز گنج جو اکبر آباد کا ایک محلہ ہے، اُس کے ویرانے میں
ایک حبشی فقیر رہتا ہے، جو کبھی دکھائی دیتا ہے اور کبھی نگاہ سے اوجھل ہو جاتا ہے۔
مجھے اس کے دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ اتفاق سے اُسی دن ویرانے سے اُس
محلّے کی بازار کی طرف اُس کا گزر ہوا۔ بازار والوں نے اُس کو دیوانہ سمجھ کر ڈھیلے
مارنا شروع کیے۔ اُس نے کہا دیکھو، ایسا نہ ہو کہ مجھ کو کوئی گزند پہنچ جائے،
اور یہ محلّہ جل کے خاک ہو جائے۔ جب بحث نے طول کھینچا تو ایک ڈھیلا اُس
کے کندھے پر لگا۔ ڈھیلے کا لگنا تھا کہ آگ کی ایک چنگاری ہَوا سے اُڑ کے
روئی کے ایک ڈھیر میں جا پڑی۔ ایک شعلہ اُٹھا اور بازار کی طرف چلا۔
دَم بھر میں وہ آگ اتنی بھڑکی کہ اُس کے بُجھانے کے لیے پانی بھی میسّر نہ ہوا۔
اینٹ، پتھر، لکڑی، غلّہ سب کا سب جل کے خاک ہو گیا۔ چھوٹے بڑے
اپنی اپنی فکر میں پڑ گئے اور فقیر نے اپنی راہ لی۔

وہ تھوڑی دیر میں دریا کے کنارے پہنچا اور اپنے پاؤں دریا میں لٹکا کر
بیٹھ گیا۔ میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے دوڑتا چلا جاتا تھا۔ اُس کے سامنے
گیا اور جرأت کر کے اُس کا نام پوچھا۔ اُس نے کہا احسن اللہ نام اور لقب
رام۔ پوچھا وطن؟ کہا دکن۔ پوچھا یہاں آنے کا سبب؟ کہا یہی آوارگی۔
میں نے کہا تم مُنہ دھو ڈالیے اور ذرا زیادہ وضاحت سے اپنا حال بیان
کیجیے۔

جب اُس نے میری منّت پر نظر کی تو کہا کہ اَے عزیز جوانی کا زمانہ تھا،
سر میں ایک شور بھرا ہوا تھا۔ ایک رات گھر سے باہر نکلا۔ بازار میں ایک
جگر سوختہ قلندر نظر آیا، جو اپنے نقرئی شیر قلاب کو جس کا پنجہ ٹوٹ گیا تھا،
ایک سُنار کی دوکان پر کھڑا درست کروا رہا تھا۔ تسبیح اُس کے ہاتھ میں تھی، اس
کو برابر پھیر رہا تھا اور یہ دعا پڑھ رہا تھا سُبْحَانَ مَنْ لَیْسَ لِلْخَلْقِ
اِلٰی مَعْرِفَتِہٖ سَبِیْل۔ اس بات کا میرے دل پر بڑا اثر ہوا۔ میں شہر سے
باہر آیا اور سراسیمہ ایک پہاڑ کے دامن میں پہنچا۔ کچھ دن وہاں کی مصیبتیں
جھیلیں، درختوں کے پتّوں پر بسر کی۔ رات دن روتا تھا، نہ بولتا تھا، نہ
سوتا تھا، دیوانوں کی طرح مارا مارا پھرتا تھا۔

ایک دن صبح کی نماز کے بعد میں روسیاہ ایک پتھر پر بیٹھا ہوا پتّوں کا ناشتا
کر رہا تھا۔ ناگاہ ایک خدا رسیدہ سیّاح میری داہنی جانب سے ظاہر ہوا۔ میں
نے اُسی پتھر پر اُس کے لیے جگہ کردی۔ دو تین پتّے اس نے بھی کھائے، ذرا
دیر آرام کیا، اور مجھ سے کہنے لگا "اے عزیز! شاید تو اُس پریشاں اختلاط
محبوب کا دل دادہ ہے، جس کی جگہ ہر دل میں ہے، اُس قیامت خرام کا وارفتہ ہے،
جو صرف اپنے لیے ہے۔ وہ سرمایۂ ناز عجب رنگین چال چلتا ہے کہ اُس کے طرزِ
رفتار سے چمن چمن جان برستی ہے۔ اُس کی بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ اگر اُس کے
دامن کی ہوا سے ایک دُنیا برباد ہو جائے تو اُس کو پروا نہ ہو۔ جس تنکے کو وہ
بڑھا دیتا ہے وہ سمندر کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتا۔ ناکامی کی تلخی کے باعث اُس
کے شیریں لبوں سے دل برداشتہ نہ ہونا چاہیے۔ وہ ناامیدی کو دوست نہیں

دیکھتا اور وہ آتش کا پرکالہ ایسے عاشق کے جھونپڑے میں قدم نہیں رکھتا۔ ناامیدی کس لیے ؟ مقصود ہم کنار ہی دل تنگی کیوں ؟ سارا عالم یار ہی۔ اُٹھ اور سیاحت کر، خوش اور مطمئن رہ۔" میں اُٹھا اور اُس کے ہم راہ ہو گیا۔ وہ آگاہ تھا، میں بھی آگاہ ہو گیا۔

" ایک دن نوارح گوالیار میں ایک فقیر کے تکیے پر میں ٹھہرا ہوا تھا۔ صبح کو نماز میں مشغول تھا۔ ناگاہ ایک طوطے نے دو تین مرتبہ بڑے پُر درد لہجے میں 'سُبحَانَ اللہ' کہا، غیرتِ عشق نے میری حالت دگرگوں کر دی اور میں بے ہوش ہو گیا۔ سیّاح نے میرے مُنھ پر پانی کے چھینٹے دیے۔ جب میں ہوش میں آیا تو مجھ سے پوچھا کہ یہ کیا تھا ؟ میں نے جواب دیا کہ طوطے کے ذکر کرنے سے میرے دل پر چوٹ لگی اور غیرتِ عشق نے مجھے بدحواس کر دیا۔ اُس نے کہا کہ اُس محبوب کا بھی عاشق کے ساتھ یہی معاملہ ہی۔ اگر وہ اُس کو غیر سے مشغول دیکھتا ہی تو دل سے اتنا نزدیک ہونے پر بھی دوری اختیار کر لیتا ہی۔ اُس کے اشارے سے فتنہ اُس کی طرف دوڑتا ہی، بلکہ جان لینے تک ساتھ رہتا ہی۔

" ایک فقیر اپنے تاریک جھونپڑے سے کبھی باہر نہیں نکلتا تھا۔ ایک دن اُس کے ایک مُرید نے کہا کہ اس شہر کی چاندنی راتیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ وہ اُس کی خاطر سے باہر نکلا۔ ابھی چاند کی طرف نگاہ بھی نہ کی تھی کہ ایک ترک ہاتھ میں خنجر لیے ہوئے پہنچا اور اُس سے پوچھنے لگا کہ فلاں شخص تو ہی ہی۔ اُس نے کہا ہاں۔ ترک نے کہا کہ لوگ تجھ کو مستجاب الدعوات کہتے ہیں۔ میرا غلام روپیوں کی ایک تھیلی لے کر بھاگ گیا ہی۔ دعا کر کہ وہ مل جائے۔ اگر دعا نہ کرے گا

تو میں تجھے قتل کر ڈالوں گا۔ درویش اصل حال سے باخبر تھا۔ سمجھ گیا کہ اُس مجسم ناز و عتاب کو یہ بات پسند نہ آئی کہ میں اُس کے چاند سے چہرے کی یاد چھوڑ کے چاندنی میں میٹھوں۔ وہ بہت متنبہ ہوا اور اُس ترک سے کہا کہ صبح صادق سے پہلے دریا کے کنارے پہنچ جا اور جو کشتی سب سے پہلے روانہ ہو اُس پر سوار ہو جا۔ انشاء اللہ تیرا مقصد حاصل ہو جائے گا۔ ترک نے ایسا ہی کیا، اور غلام کو مع روپے کے اُس کشتی میں پایا۔ وہ درویش مرتے مر گیا مگر پھر نہ کسی سے ملا، نہ باہر نکلا۔

جب میں نے آگے بڑھنے کا قصد کیا تو وہ سیاح سامنے آیا اور کہنے لگا کہ مجھ مفلس کو کن خرابیوں کے بعد تیری سی دولت جنگل سے ہاتھ لگی ہی۔ افسوس کی بات ہی کہ میں تجھ کو ہاتھ سے کھو بیٹھوں۔ یہاں سے دس پندرہ کوس کے فاصلے پر ایک مشہور قصبہ باڑی ہی۔ وہاں میرے پیر کی قدم گاہ ہی۔ اگر چند روز کے لیے تو بھی وہاں چلے تو میں وہاں چراغ جلاؤں اور سعادت دارین حاصل کروں میں نے کہا خدا حافظ۔ وہ تو اُدھر گیا اور میں شہر کے نواح کے ویرانے میں آکر مقیم ہو گیا۔ دس مہینے کی مدت تنہائی میں بسر کی۔ آج وحشت مجھے شہر کی طرف لے آئی۔ اس جگہ کے بہائم صفت لوگ میرے خون کے پیاسے ہو گئے۔ اب میں یہاں اُس طرف کے اشارے کا منتظر بیٹھا ہوں۔" جب شام ہو گئی تو وہ نماز میں مشغول ہو گیا۔ میں اپنے گھر چلا آیا۔

صبح کو میں پھر اس کی خدمت میں پہنچا۔ دیکھا کہ اُسی طرح بیٹھا ہوا ہی۔ کھانا میرے ساتھ تھا، میں نے پیش کیا۔ دو تین لقمے کھا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ میں نے کہا

لوٹا اور طشت حاضر ہے اور غلام موجود ہے۔ کہنے لگا میں درویش ہوں، مجھے اِن چیزوں کا پابند نہیں ہونا چاہیے۔ شاید تم نے مولانا کاتبی کے یہ شعر نہیں دیکھے:۔

کاے بے زراں چہ حاصل از گنج در خرابہ   در قصرِ لاجوردی خطّیست بر کتابہ

گر ماہ طشت داری در مہر آفتابہ   پایانِ کار باید از جملہ دست شستن

میں نے کہا فرش کے لیے چٹائی لایا ہوں، وہ بولا مجھے خاک سے سروکار ہے۔ میں نے کہا ایک نئی چادر بہم پہنچائی ہے، وہ بولا یہ بوجھ اپنے کندھے پر نہ ڈالوں گا۔ میں نے کہا پانی کے لیے ایک کاسہ خریدا ہے، وہ بولا کہ میں نے کاسہ سر سے توڑ ڈالا ہے۔ میں نے کہا خرچ کے لیے قدرِ قلیل حاضر ہے، وہ بولا کہ اس سے میں نے دل نہیں لگایا ہے۔ میں نے کہا اس میں سے کچھ تو قبول ہو، اُس نے کہا کیا چاہتے ہو کہ فقیر ملول ہو؟ میں خاموش ہو رہا۔

اُس زمانے میں ایک عورت خوب صورت، خوش رنگ، شوخ و شنگ، چھینٹ سازوں کے قبیلے کی پانی بھرنے کے بہانے سے صبح و شام دریا پہ آیا کرتی تھی۔ ایک عالم اُس پہ فریفتہ ہو رہا تھا۔ وہ مٹی کا گھڑا کندھے پہ رکھے ہوئے بڑے ناز و انداز سے فقیر کے سامنے آئی۔ اُس نے کہا کہ اے دل و دین کو غارت کرنے والی! اس قدر گم راہی! جا، رام رام کہا کر۔ یہ سنتے ہی اُس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، منھ پہ خاک ملی اور رام رام کہتی ہوئی اِدھر اُدھر دوڑنے لگی۔ آخر اُس کا دل خون ہو گیا، جنون بہت بڑھ گیا، کھانا پینا چھوٹ گیا اور چند روز میں ختم ہو گئی۔

جب یہ خبر فقیر کو پہنچی تو اُس نے بڑا افسوس کیا۔ میں نے کہا یہ کیا ہوا۔ اُس

نے کہا مقدّر یہی تھا فقیر کا کچھ جُرم نہیں ہے، مقدّر سے کوئی چارہ نہیں ہے۔ کیا تم نے نہیں سُنا کہ ایک فقیر بہت بیمار ہو گیا۔ طبیب نے پرہیز کی سخت تاکید کی۔ اُس نے کہا کہ یہ امر تقدیری ہے یا غیر تقدیری۔ اگر غیر تقدیری ہے تو مجھ کو نقصان نہیں پہنچ سکتا اور اگر تقدیری ہے تو میں بچ نہیں سکتا۔

وہ فقیر دو تین دن اور دکھائی دیا۔ اس کے بعد ایک دن سنائی دیا کہ اُس قلندر نے دو تین نعرے لگائے اور دریا کے کنارے سے کہیں اور چلا گیا۔

تیسری حکایت

شاہ برہان ایک خدا رسیدہ فقیر تھا۔ جب کبھی شہر میں آتا تھا تو پتھر پر پتّھر مارا کرتا تھا۔ ایک دن سوادِ شہر میں وہ مجھے دکھائی دیا۔ نہایت سفید چیز کا کوئی آدھ سیر کا ایک گولا ہاتھ میں لیے ہوئے ایک درخت کے سائے میں بیٹھا ہوا تھا اور بار بار اُس کی طرف دیکھتا تھا۔ مجھے گمان ہوا کہ خالص چاندی ہے۔ آخر میں نے پوچھا کہ یہ کیا چیز دیکھ رہے ہو؟ کہنے لگا چاندی بھی بہ قولِ مرتضیٰ علی علیہ الصّلوات عجیب چیز ہے، کہ جب وہ ہاتھ سے نکل جاتی ہے تو اُس کا نفع اُٹھایا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ تم فقیر ہو، تم کو اس کی کیا پروا، یہ چاندی مجھ کو دے دو۔ اُس نے چاندی ہاتھ سے ڈال دی اور اپنی کالی کملی اُٹھائی۔ میں نے اُس کی کملی پکڑ لی اور کہا کہ زرا دیر ٹھہرو اور مجھ گنہ گار سے کچھ باتیں کرو۔ اُس نے میری دل شکنی نہیں کی، ہنسا اور بیٹھ گیا۔ میں نے پوچھا کہ آج خاک میں اَٹے ہوئے تم کہاں سے آئے تھے؟ جواب دیا من اللہ۔ میں نے پوچھا

کہاں جاؤ گے؟ کہا الی اللہ ۔ میں نے پوچھا جنگل میں اپنی بسر کے لیے کیا سرمایہ تمھارے پاس ہی؟ جواب دیا کہ مجھ سے بے سر و پا کا سرمایۂ دُنیا و آخرت اللہ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہی۔ میں نے کہا کہ تم جب دکھائی دیتے ہو تو پتھر پر پتھر مارتے ہوئے چلتے ہو۔ یہ کیا طریقہ ہی؟ جواب دیا کہ پتھر پر پتھر مارنا اشارہ ہی تباہی کی طرف۔ سمجھ لو کہ شہر کے باہر کی آبادی ویرانہ ہو جائے گی اور یہ صحبتیں افسانہ۔ اُس نے جو کچھ کہا تھا تھوڑے ہی دن کے بعد ظاہر ہو گیا۔

قلندر برہنہ تن شاہ مدن جو اُس کا ہم عصر ایک صاحب حال اور باکمال فقیر تھا، جَو کی روٹی کے سوا کچھ نہ کھاتا تھا۔ شبِ جمعہ اس کے تکیے میں جو مدار دروازے کے پاس تھا، روشنی ہوتی تھی۔ ایک دُنیا چراغاں کی سیر کے لیے وہاں جاتی تھی۔ اُس کی صبح کو وہ گدائی کے لیے نکلتا تھا اور پیسے کے سوا کسی سے کچھ نہ مانگتا تھا۔ پیسہ مانگتا جاتا تھا اور یہ شعر پڑھتا جاتا تھا

آوردنِ زر بدست آسان نبود

خوابیدہ بروے ہر فلوسے شیرے

وہ ایک دن نخاس میں، کہ ہندوستان میں گھوڑوں کی بازار کو کہتے ہیں، آیا اور میرے قریب بیٹھ گیا۔ میرے دل میں یہ خیال گزرا کہ یہ فقیر بیش تر سے مجھ سے واقف نہیں ہی۔ اگر خود بہ خود خدا گوئی شروع کر دے تو میں جانوں کہ یہ ضرور صاحب کمال ہی۔ ابھی ایک لمحہ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ میرے اس خیال سے واقف ہو گیا اور کہنے لگا کہ اے عزیز! جس کو اللہ کہتے ہیں میں اور تو دونوں اُسی کی تلاش میں ہیں۔ وہ عجب فتنہ گر اور خود سر ہی۔ جب پروا کرتا ہی تو گلِ تر کو خاک میں ملا دیتا ہی، ادنیٰ

اور اعلیٰ کا وجود باقی نہیں رکھتا اور کم زور چیونٹی کی حفاظت کرتا ہی۔ ایک دفعہ مصر میں خشک سالی ہوئی، کیسے کیسے دل بر ہلاک ہوے اور کیسے کیسے لوگ خاک ہوے۔ جب اہل شہر سخت پریشاں ہوے تو ذوالنّون سے التجا کی۔ وہ اپنے وقت کا ولی تھا، اُس نے باطن کی طرف توجّہ کی۔ ظاہر ہوا کہ اس جنگل میں ایک سورنی نے بچّے دیے ہیں۔ جب ابر آتا ہی تو وہ آسمان کی طرف مُنہ کرتی ہی، یعنی اگر بارش ہوگئی تو یہ بچّے تلف ہو جائیں گے۔ اگر اس شہر کا رئیس اُن کی حفاظت اپنے ذمّے لے لے تو ایک ابر دریا بار اُٹھے اور صحرا صحرا برسے۔ جب لوگ اُن کی حفاظت کو دوڑے تو اس سخت مصیبت سے نجات پائی۔ یہ بھی کوئی معقول بات ہی کہ سوٗر کے بچّوں کے لیے آدمی بے آبی سے ہلاک ہوں۔

جب وہ بے پروائی برتتا ہی تو ایک تنکا سیلاب کی آبرو خاک میں ملا دیتا ہی۔ چنگیز کے قتلِ عام میں شہر ہرات کے ایک لاکھ جان داروں میں صرف تین آدمی بچے، جو پُرانی قبروں میں گھُس گئے تھے، ایک مسجد جامع کا واعظ اور دو اور۔ جب فوج چلی گئی تو واعظ نکلا اور منبر پر بیٹھ کر کہنے لگا کہ آج "تنزیہ" ہی، اطمینان سے وعظ کہا جا سکتا ہی۔ اُس کی آواز سُن کے وہ دونوں آدمی بھی مسجد میں داخل ہوے۔ اُس کو یہ بات ناگوار ہوئی کہ پھر کثرت ہوگئی اور تشبیہ پیدا ہوگئی اُسی وقت لٹیرے آپہنچے اور ان تینوں کو خاک اور خون میں ملا دیا۔

جب اس بلا نے آسمان تک سر اُٹھایا اور شیخ نجم الدّین کبریٰ تک پہنچ گئی تو وہ اپنے کرتے کا دامن گردان کے، ڈھیلے ہاتھ میں لے کے، جہاد کے ارادے سے خانقاہ سے نکلے اور میدان میں آکھڑے ہوے۔ ناگاہ ایک خوب صورت ترک بچّہ

آیا اور اُس نے ایک نیزہ اُن کے سینے پر مارا۔ شیخ نے وہ نیزہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کہا کہ اے جوان تو سمجھتا ہے کہ میں ترکستان سے آرہا ہوں، مجھ کو نہیں جانتا۔ مگر میں تجھ کو خوب پہچانتا ہوں۔ وہ ہنسا اور نیزے کو زور سے اُن کے سینے سے کھینچ لیا۔ شیخ اُسی وقت خاک پر گر پڑے اور انتقال کر گئے۔

غرض کہ خدا عجیب خود نما اور خود آرا دل بر ہے کہ اُس کی راہ میں قیامتیں برپا ہوتی ہیں اور اُس کے طرز رفتار سے بلائیں برستی ہیں اُس کے معاملات کسی کی سمجھ میں نہیں آتے۔ یہاں عقل و فہم سب بے کار ہیں۔

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ شاہ برہان سات آٹھ سیر مٹھائی اپنی کملی میں باندھے ہوئے ظاہر ہوئے۔ شاہ بدن نے آواز دی، اُنھوں نے رفتار تیز کی۔ یہ زور سے چلائے، اُنھوں نے اور قدم بڑھائے۔ اُنھوں نے کہا شاید تیری کملی میں کتّے کے پلّے ہیں۔ اُس نے کملی پھینک دی اور خود قبرستان میں پہنچ کر چھپ رہا۔ سارا دن کملی اور مٹھائی راستے میں پڑی رہی، کتّوں نے بھی نہیں کھائی۔ آخر محلے والوں کے کہنے سے خاک روب اُٹھالے گئے۔

دوسرے دن جب لوگوں نے شاہ برہان کو دیکھا اور حقیقت حال پوچھی تو کہنے لگا وہ شاہ میں گدا، میرے اُس کے نسبت کیا۔ خیر گزری کہ اس کی زبان سے یہی نکلا۔ اگر کہیں کہہ دیتا کہ تو کتّے کی طرح کہاں بھاگا جا رہا ہے، تو یہ دیوانہ کتا ہو جاتا اور ویرانے میں ہر طرف دوڑتا پھرتا۔ میں نے کملی اور مٹھائی سے ہاتھ دھویا، خدا خدا کر کے آدمی رہ گیا۔

ایک دن میں (میر) ایک بیاض ہاتھ میں لیے ہوئے بازار میں بیٹھا تھا

کہ اُس دیوانے (شاہ برہان) کا گزر اُدھر سے ہوا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ روح کے بدن سے جدا ہو جانے کے بعد کا کچھ حال بھی اس بیاض میں لکھا ہے۔ میں نے کہا کہ اس میں رُباعیاں اور متفرق شعر ہیں۔ کہنے لگا اگر سُنو تو میں بیان کردوں۔ واضح ہو کہ لذّت کسی خوش گوار چیز کے پانے میں ہے اور الم اُس کے خلاف چیز پانے میں۔ قوائے انسانی میں سے ہر قوت اپنی استعداد کے مطابق لذّت اور الم کا ادراک کرتی ہے۔ چنان چہ باصرہ کو محبوب کے دیدار میں اور سامعہ کو اچھّی آواز سننے میں لذّت ملتی ہے۔ اور شئے مدرک جس قدر عظیم ہوتی ہے اُسی قدر لذّت زیادہ ہوتی ہے۔ پس چوں کہ ذات و صفات واجب الوجود سے شریف تر کوئی مدرک نہیں، اس لیے اُس کی معرفت سے زیادہ خوش گوار کوئی لذّت نہیں۔ جسمانی قوتیں بدن کے ساتھ زائل ہو جاتی ہیں اور قوّتِ عقلی جو لذت و الم کا احساس کرتی ہے، نفس ناطقہ کے ساتھ باقی رہ جاتی ہے۔ نفس جب تک جسم سے متعلق رہتا ہے اس کا ادراک ضعیف ہوتا ہے اور نفس مجرد اُس (خدا) کے جمال کا مشاہدہ کرتا ہے۔ سنو، نفس دو حال سے خالی نہیں، یا نقص رکھتا ہے یا کمال۔ کمال کے بھی دو حال ہیں، علوم یا اعمال۔ کمال علمی اس کی قدرت کی دلیلوں پر نظر کرنا ہے اور کمال عملی نفس انسانی کا مجرد ہو جانا۔ جو کچھ میں نے کہا یہ مقالات ہیں اور جسموں سے جدا ہونے کے بعد نفسوں کے یہ مختلف حالات ہیں۔

چون بمنزل برسی راہ دگر پیش آید
این مپسندار کہ مُردی و سخن کوتہ شد

اگر نفس بچّوں اور نادانوں کی طرح سادہ اور پاک ہے، تو لذّت اور الم سے آزاد ہے

سادہ اور ناپاک کے سر پر دُنیا خاک ہی کہ جسم کی کشش اُس کو نہیں چھوڑتی اور وہ اُس بلند مرتبہ معشوق سے کوئی ربط نہیں رکھتا۔ پاک اور کامل خوش ہی کہ اُس کو لذّتِ وصال حاصل ہی۔ کامل اور ناپاک کے لیے کچھ دن غم و الم ہی۔ اُس کے اور معشوق کے درمیان ایک پردہ پڑ جاتا ہی۔ کچھ مدّت کے بعد جب وہ لوث اُس سے زائل ہو جاتا ہی، تو کریم اُس کی دوری پسند نہیں کرتا اور وہ جواہرِ عقول میں شامل ہو جاتا ہی۔ ناکامل و ناپاک ہمیشہ الم ناک رہتا ہی۔ واجب ہی کہ اس جوہرِ علوی کو عقول کے درجے تک پہنچا دو، تاکہ اُس سے قطعِ تعلق کے بعد الم میں مبتلا نہ ہو۔

شام نزدیک تھی وہ باتیں کرتا ہوا شہر کے قریب کے قبرستان میں جہاں وہ رہتا تھا جا چھپا۔ میں نے سُنا کہ اُسی رات کو چاندنی میں دیوانگی کے جوش میں چکر کھاتا پھرتا تھا کہ ایک قبر کے پتھر سے ٹھوکر کھائی اور صبح ہونے سے پہلے انتقال کیا۔

چوتھی حکایت

اسد دیوانہ ایک مجذوب فقیر تھا جس کا تکیہ فیروز خاں کے تالاب پر تھا۔ اکثر رندانِ باغاتی وہاں جا کے دھوپ کی تیزی سے پناہ لیتے تھے۔ اور یہی لوگ گویا اُس کے پیش خدمت تھے۔ ایک دن میں نے سُنا کہ اُس کے تکیے میں جشن ہو رہا ہی اور جو مسجد اُس نے بنائی تھی اُس میں لوگ ناچ رہے ہیں۔ میں گیا اور دیکھا کہ وہ گھنٹی اور زنجیر کمر میں باندھے ہوئے ننگے بدن سب کے بیچ میں بیٹھا ہوا ہی۔ اُس نے مجھ کو دیکھا اور میرا حال پوچھا۔ جب شام ہوئی تو کھانا آیا اور

سب نے مل کے کھایا۔

کھانا کھانے کے بعد ایک جوگی جس کا نام ناتھ تھا آیا اور فقیر کے سامنے بیٹھ گیا۔ فقیر اس سے دل لگی کی باتیں کرنے لگا۔ اثنائے گفتگو میں حشرِ اجساد کا ذکر نکلا۔ جوگی نے کہا کہ بعث و حشر کے ثبوت میں تو بہت سی دلیلیں ہیں لیکن نفس کا اُسی بدن میں واپس آنا دشوار ہے۔ مثلاً آدمی مرا اور خاک ہوگیا، ایک مدّت کے بعد وہ خاک گھاس میں تبدیل ہوگئی، گھاس کو کسی جانور نے چر لیا اور وہ جانور انسان کی خوراک ہوگیا۔ اب اگر حشر ہوگا تو کس صورت میں ہوگا۔ اِسی کے ساتھ نفوس کی انتہا نہیں ہے اور اجسام اور مادّے کی ایک حد ہے۔ اگر حشر ہوا اور مادّہ تقسیم کیا گیا تو نفوس مادّے سے یقیناً زیادہ نکلیں گے۔ پھر کہنے لگا کہ میں کچھ نہیں جانتا، مگر اتنا جانتا ہوں کہ روح انسانی بہ ذاتِ خود قدیم ہے اور موت کے معنی روح کا معدوم ہونا نہیں، بلکہ قالب سے اس کے تعلق کا قطع ہو جانا ہے۔ بعث و حشر کے معنی یہ نہیں ہیں کہ روح کو وہی قالب ملے گا قالب ایک سواری سے زیادہ نہیں ہے۔ اُس کے بدل جانے سے سوار کا کیا نقصان ہے۔ جو لوگ قالبِ اوّل کی شرط لگاتے ہیں وہ بیہودہ بکتے ہیں۔ چوں کہ یہ پہلی ملاقات تھی، ہم نے رخصت چاہی اور میں اور جوگی دونوں ساتھ اُٹھے۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ وہ فقیر (اسد) اُس جوگی سے باتیں کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ اے عزیز! میں نے دل ایسے دل بر کو دیا ہے جس کا دیکھنا اِن آنکھوں سے ممکن نہیں۔ بدگمانی میرے بے قرار دل کو ہر وقت نہ معلوم کہاں کہاں لے جاتی ہے۔ ہر شخص اس کو اپنا خدا کہتا ہے۔ ہر بے سر و پا اپنے میں اُس کا

پتا دیتا ہے۔ حیران ہوں کہ یہ کیسی خصوصیت ہے۔ نہیں معلوم کہ کیسی معیت ہے۔ میں اپنی ہلاکت پر آمادہ ہوں اور اس خرابی سے اس خرابے میں پڑا ہوا ہوں۔ دن رات پیچ و تاب میں رہتا ہوں، مگر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اگر تجھے کچھ آگاہی ہو تو پریشان نہ ہو۔ اس لیے کہ یہاں جو کچھ ہے شوق ہے، باقی سب ہیچ ہے۔ اگر شوق حدِّ کمال پر ہے تو عاشق منزلِ وصال پر ہے۔ جس قدر شوق میں قصور ہے، اُسی قدر راہ دور ہے۔ شوقِ کامل مقصودِ دل تک پہنچا دیتا ہے اور عاشق کو معشوق بنا دیتا ہے۔ انسان کا کمال معرفت ہے اور معرفت کا کمال حیرت۔ اگر تو اُس کے کمالات میں حیراں ہے، تو خوش حال ہے اور اگر حقیقتِ حال کے متعلق گفتگو کرتا ہے تو یہ عینِ وبال ہے۔ سُن، دُنیا ایک گزرگاہ ہے۔ یہ منزل نہیں ہے، راہ ہے۔ لوگ قافلہ قافلہ چلے جا رہے ہیں۔ یہاں دامن گردانے ہوئے رہنا چاہیے اور زادِ سفر کی فکر رکھنا چاہیے۔ ایک فقیر ہمیشہ قصر نماز پڑھتا تھا۔ کسی نے اُس سے کہا کہ قصر سفر میں ہونا چاہیے، نہ کہ وطن میں۔ اُس نے جواب دیا کہ ہر نفس اور ہر آن اپنے مرتبے سے گزر رہا ہوں اور ہر لمحہ پانی کی طرح تلف ہو رہا ہوں۔

جائے کہ چوں نماز سفر عمر کوتہ است
بے جا بود کہ فکرِ اقامت کند کسے

ایک دن نمازِ مغرب کے بعد میں (میرؔ) نے بڑی جرأت کر کے اُس سے کہا کہ اے درویش! جس دن سے میں نے روحانی بہشت اور دوزخ کا ذکر سنا ہے میں پریشان ہوں اور کچھ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر آپ اُسے بیان کریں تو بڑا احسان ہو۔ کہنے لگا کہ سُن، اے جوان! وہ بہشت اور دوزخ جس میں قالب

شریک ہی مشہور و معروف ہی۔ ایک کا حاصل ہی حور و قصور و انہار و اشجار۔ اور دوسرے کا زہر و زقوم و نار و مار۔ لیکن بہشت و دوزخ روحانی۔ یعنی لذّت و الم جانی، اُس (بہشت روحانی) کا حاصل معقولات کی دریافت اور اُس ماہِ تمام کا مشاہدہ ہی۔ اور اس (دوزخ روحانی) کا نتیجہ شرم، ندامت، کوفت اور غم ہی۔ حکما کہتے ہیں کہ موت کے بعد روح کے لیے لذّتِ عظیم ہی، یا الم الیم۔ نفوس کاملہ کے لیے لذّتِ دوام ہی اور ناقصہ کے لیے الم مدام۔ بہشت و دوزخ سے انھیں دو حالوں کی طرف اشارہ ہی۔

ایک دن مجھ پر بہت مہربان ہو کر کہنے لگا کہ اے جوان! تیرے انداز سے معلوم ہوتا ہی کہ تیرے سر میں فقیری کا سودا ہی۔ اس خیال سے باز آ۔ فقیری میں پہلا قدم اپنی ہلاکت میں کوشش کرنا، یعنی مرگ طبیعی سے پہلے مرنا ہی، اور دوسرا قدم خود کو نہ دیکھنا، یعنی اپنے آپ کو نظر میں نہ لانا ہی۔ اس دو قدم راہ کا طے کرنا بڑا مشکل کام ہی۔

ایک دن میں (میر) فقیر کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کہنے لگا کہ اے جوان! کل میں نے ایک خواب دیکھا ہی، جو میری موت کی خبر دیتا ہی، یعنی یہ کہ میرے پیر نے مجھ کو گلے لگایا اور جدائی کی شکایت کی۔ شاید اب زندگی کے دن پورے ہو گئے۔ میں نے کہا کہ خدا آپ کو سو برس تک سلامت رکھے۔ خواب محض خیال ہی، اُس کا کیا اعتبار۔ اُسی ہفتے میں سُنائی دیا کہ وہ سرسام میں مبتلا ہو کر دنیا سے اُٹھ گیا۔ خدا بخشے خوب آدمی تھا۔

پانچویں حکایت

جب زمانے نے میرے ساتھ بدی کی اور مجھ کو اکبر آباد سے آوارہ کردیا، تو میں نے دہلی کا رُخ کیا اور میاں سعید خاں کی خدمت میں پہنچا۔ وہ ایک مردِ کامل، نیک دل، خوش خلق، سیر چشم بزرگ تھے۔ اکثر شہر کے بزرگوں کی محفل میں جاتے تھے اور بالکل آخر میں بیٹھتے تھے۔ تمام بڑے بڑے لوگ اُن کا ادب کرتے تھے، رفتہ رفتہ صفِ نعال مقام صدر بن جاتی تھی۔ سبزانِ نوخط سے ربط رکھتے تھے، کوچہ و بازار میں گھومتے پھرتے تھے۔ شاہ و وزیر اُن کی ملاقات کے متمنّی رہتے تھے، مگر وہ کسی کی طرف التفات نہ کرتے تھے۔ امیر لوگ بڑی بڑی رقمیں دیتے تھے اور خود ہی احسان مند رہتے تھے۔ ایک دفعہ وزیر سے چالیس ہزار روپے لے کے قدم شریف کے شکستہ حوض کی مرمت کروا دی اور باقی روپیہ غریبوں، فقیروں اور مسافروں کو تقسیم کر دیا۔

جب اُن کی عمر پچاس برس کی ہوئی تو خلوت نشینی اختیار کر لی۔ روزانہ صبح کی نماز کے بعد قبرستان چلے جاتے تھے اور دوپہر کے قریب واپس آتے تھے۔ ایک دفعہ میں بھی اُن کے پیچھے ہو لیا۔ دیکھا کہ ہر قبر پر عبرت کی نظر ڈالتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ناگاہ میرے پاؤں کی آہٹ اُن کے کانوں میں پہنچی، پیچھے پھر کے ذرا سخت لہجے میں کہا کہ دوستی میں بہت بے تکلفی مجھے اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ مجھ پر اس قدر خوف غالب آیا کہ قدم اُٹھانے کی طاقت نہ رہی۔

ایک دفعہ کیا دیکھتا ہوں کہ کوئی چیز اپنی چادر میں باندھ کر لا رہے ہیں۔

میں آگے بڑھا اور پوچھا کہ آپ کیا لائے ہیں؟ کہنے لگے کہ اس محلّے میں ایک بڑھیا ہے، جو بڑی تلخی سے اپنی زندگی گزارتی ہے اور خاک پر پڑی ہوئی بھیک مانگا کرتی ہے۔ اُس کے لیے اُنھوں نے مٹھائی بھیجی ہے۔ آؤ چل کر اس کو یہ مٹھائی کھلا آئیں۔ میں بھی اُس کے ساتھ ہو گیا۔ ایک بُڑھیا کو سرِ راہ اُسی حال میں دیکھا۔ وہ اُس کے سامنے جاکر کہنے لگے کہ اُٹھ اور مٹھائی کھا۔ اُس ضعیفہ نے مدّت سے مٹھائی کا نام بھی نہ سُنا تھا، کھانے کا کیا ذکر۔ گھبرا کے اُس نے اپنا سر اُٹھایا۔ فقیر نے وہ سب مٹھائی اُس کے سامنے رکھ دی۔ اُس نے خوب پیٹ بھر کے کھائی اور سو رہی۔ اُنھوں نے میری طرف منھ کیا اور کہا "راحت بدل رسان کہ ہمین منزل است وبس۔

ایک دن بازار میں ایک کتّا بھوک کی شدّت میں سوکھی ہڈّی کھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اتفاقاً ہڈّی کا ایک ریزہ اس کے دانت میں چُبھ گیا اور خون نکل آیا۔ کتّا سمجھا کہ یہ خون ہڈی میں سے نکل رہا ہے اور اُس نے ہڈی کو چبانا شروع کیا۔ درویش اس حالت کو دیکھ کے بے چین ہو گیا۔ اِسی اثنا میں ایک ہیجڑا نان بائی کی دوکان سے روٹی سالن لے کر چلا۔ درویش نے اُس سے کہا کہ مدّت سے ہم تم ایک ہی محلّے میں رہتے ہیں۔ آج تک تم نے میری کوئی حاجت پوری نہیں کی۔ اگر یہ روٹی سالن مجھ کو دے دو تو بڑا احسان ہو۔ وہ درویش کو پہچانتا تھا، بولا قربان جاؤں، جان جو دُنیا میں سب سے پیاری ہے، آپ کے لیے وہ بھی عزیز نہ کرتا، روٹی سالن کیا چیز ہے۔ مختصر یہ کہ وہ روٹی سالن اُس سے لے کر کتّے کے سامنے رکھ دیا۔ سچ ہے جو لوگ دل میں راہ رکھتے ہیں وہ کتّے کی بھی

دل جوئی کرتے ہیں۔

ایک دفعہ برادر گرامی قدر محمد حسین کلیمؔ نے شکایت کی کہ بے روزگاری سے سخت پریشان ہوں، میرے لیے بھی کبھی کوئی مراعات ہو، یا کسی کو اشارہ کر دیا جائے کہ زندہ تو رہ سکوں۔ کہنے لگے کہ مراعات کا شکوہ بجا ہے، لیکن میرا اختیار کیا ہے۔ رہا کسی سے کچھ کہنا، تو یہ بات وقت پر موقوف ہے۔ انھوں نے اسی رات کو خواب میں دیکھا کہ درویش نے اسحٰق خاں شہید کے چھوٹے بھائی مرزا محمد علی سے میری نوکری کے لیے کہا اور انھوں نے منظور کر لیا۔ دو ہی تین دن کے بعد وہ چالیس یا پچاس روپے کے نوکر ہو گئے۔ انھوں نے یہ معاملہ درویش سے بیان کیا۔ کہنے لگا کہ خوابِ پریشاں کا کیا اعتبار، الحمدللہ کہ تم کامیاب ہو گئے۔

باوجودے کہ وہ یادِ الٰہی میں محو رہتے تھے پھر بھی شعر و شاعری سے خاص ربط رکھتے تھے۔ ایک دن صبح کو مجھے بلا بھیجا۔ جب میں حاضر ہوا تو کہا کہ خفقان کی شدت ہے، طبیعت کو کسی طرح سکون نہیں ہوتا۔ کچھ عاشقانہ شعر پڑھو کہ میں خوب روؤں۔ اتفاقاً یہ شعر میری زبان سے نکلا۔

مبر بہ پیشِ دلِ ناشکیبِ من نامش　　　که از برائے تپیدن بہانہ می طلبد

انھوں نے ہاتھ دل پر رکھ لیا اور غش ہو گئے۔ لوگ ان کو اٹھا کر گھر میں لے گئے۔ وہ پھر باہر نہ نکلے۔ دو تین دن عجب حال رہا، کبھی غش کبھی افاقہ، آخر گزر گئے۔ خدائے کریم ان کو بخشے اور غریقِ رحمت کرے۔

سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ

مارچ ۱۹۲۹ء

بعدِ حمد و ثنائے قادر سخنے کہ بہ یک حرف جریدۂ عالم را از قلم رَدِ عدم بہ صفحۂ ہستی جلوہ داد، و تحیاتِ زاکیاتِ اُمییے کہ آشنا بہ حرفِ منفصل نبود و اوّل بسم اللہ سر بہ جہانِ معنی نہاد، می گوید فقیر حقیر **میر محمد تقی** متخلص بہ **میرؔ** کہ درین ایّام فیض علی پسرِ من ذوقِ خواندن ترسل پیدا کردہ بود، لٰہذا حکایاتِ خمسہ متضمن فوائدِ بسیار را باندکِ فرصت نگاشتم و مراعاتِ اسم او نمودہ نام نسخہ **فیضِ میر** گزاشتم۔ ہر کہ این حکایات خمسہ را بہ دل بخواند غالب کہ در رنج و سختی نہ ماند۔

حکایت ۱

روزے با درویشے شاہ ساہا نام، مستغرقِ شوقِ صبح و شام، حالاتش بر السنہ مذکور، بہ شیر آہو خانہ، مشہور، برخوردم۔ التفاتِ بسیارے

کرد وگفت کہ اے جوان درچہ خیالی، کہ این ہمہ پریشان حالی ۔ اگر بہ آن سراپا نازسرے داری، باید کہ بہ خود نظرے داشتہ باشی با آن ہمہ تنزہ وتقدّس علاقۂ دارد کہ اورا از تو فرق نتوان کرد ۔ این نیست کہ پیدا نیست، یا این جا ہست وآن جا نیست ۔ ہرچند از کمالِ ظہورِ حُسن چون آفتابِ نصف النّہار درحجاب است امّا کدام ذرّہ از ذاتِ عالم دیدۂ کہ بے پرتوِ آن آفتاب است ۔ زمان زمان بیندیش وبہ خود فرورد ۔ مقصود توئی، بہ کامِ جان وصل شو۔

جُدا از خود چہ می جوئی تو ہم کردہ ہجورت اگر معنی ہمیں معنی دگر صورت ہمیں صورت

سانگہ مشکیزہ بردوش گرفتہ بیازار می آمد وآوازہ می داد کہ اے خشک دہانانِ ساحلِ دریاے کم آبِ ہستی ! اگر از شما کسے لب تر کردنے منظور دارد خوش باشد ۔ ہرگاہ مردمان بردگرد می آمدند کسے را شربتِ شکر خام د کسے را پراز شیر جام می داد ۔ ریاکارے نبود، آب و شیر نہ می کرد ۔ قدم پیش می نہاد ۔

یکے پاسے از شب گزشتہ روے سُخن بہ سوے من کرد کہ اے عزیز! اگر نانِ جوان دست وہد این پیرِ ضعیف سیر خورد ۔ چون برخاستم،

گفت کجا؟ گفتم موافق اشاره کاربند می شوم۔ گفتا برو اماّ گمان نہ خواہی برد کہ نان می گویم و جان می دہم۔ من شیرم شکم را نان سماط نہ می کنم، نانِ گربہ را بہ تیر نہ می زنم۔ گفتم استغفراللہ، این چہ معنی دارد۔ آب بر دستِ چون تو درویشے ریختن نان پختن است۔ و نان بہ خون تر شدن، این جا نان بہ روغن اُفتادن۔

دمے کہ بہ خانہ آمدم دیدم کہ مردمان ہمہ در خوابند، مگر کھنہ دامے کہ غَلطْ و اغلَطْ می کرد۔ التجا بہ او بردم۔ آن مردہ شو بردہ بعدِ رکیدنِ بسیار نان پختہ بہ دستِ من داد۔ چون پیش فقیر بہ رَدم، گفت کہ این نان قابلِ خورد آدمی نیست۔ بر این مادہ سگے عففے کردہ است۔ زود از این جا برو اَرو پیشِ سگان بینداز۔ غرض کہ او ہرگز نہ خورد و مرا این معنی از ہوش برد۔

عجوزِ رَوغن فروشے معتقد داشت۔ اکثر چرب زبانی بہ کار می برد۔ پارۂ نانے دم آبے از خانہ اش می خورد۔ یکے بر فقیر حالتے بود۔ بنم از بند جُدا، سر معلّق در ہَوا۔ آن سال خوردہ بہ سرِ وقتِ او اُفتاد و از مشاہدۂ این حالت فریاد برآورد کہ اے اہلِ محلّہ کسے میاں ساہا را

کشت. هنگامه برپا شد. درویش از شور و غوغا از آن حالت به حالِ اصلی خود آمده هر دو دست بر زمین زدن و نفرین کردن آغاز نهاد، که از هر که این راز بر روی روز افتاد و مِن مجروح را بخیه بر چهره رفت، امشب پسر او را خون بگیرد، خودش بخواری به میرد، ناگهان آتش در افتد، رسم باشش و بود بر افتد، از من آثار نماند، این جا دیّار نه ماند، آبادی غیرتِ وادی شود، مار به عصا راه رود، مردمان تباه، خانها سیاه، ازین سرتا بان سر ویرانه، این باهم نشستنها افسانه، محلّه را آب برد، این جا تو نبرد. در این میان روز به آخر رسید. دست و دهن به آب کشید. قصدِ نمازِ دیگر کرده به لطف با من سر کرد که اے عزیز! امروز پیش از شام برو، موجبِ تشویش فقیر مشو. محلّه محلِّ نزولِ حادثات به نظر می آید. قریب است که عافیت بار بندد و بلا رو نماید. حاصل که مرا دل داد و در فکرِ نماز افتاد.

چون شب پردۂ ظلام فروهشت، قریب دو صد دزد بسرِ هنگی تمام شمشیرها کشیده در آمدند، و دو سه کس کمندها انداخته بالائے بامِ

عجوز بر آمدند۔ پسرِ خون گرفتۂ او خود را بر روے آنہا کشید، و بہ یک ضربتِ تیغ آب گیری کردہ بہ خاک و خون غلطید۔ مشعل افروختہ خانہا را آتش دادند، و بہ خاطرِ جمع دستِ غارت کشادند۔ کسے روے غربانہ دید۔ کار بہ تمامی کشید۔ تا دلِ شب کل مکمل بود، شب گردِ روسیہ رو نہ نمود۔ وقتے کہ ہنگامہ فرو شد یعنی وزدان خانہا را بار کردہ بردند، کسان را از فرطِ ہراس محلّہ را خالی گزاشتہ بدر زدند۔ ہنوز جاے باش مقرر نہ شدہ بود کہ ابرِ سیاہے سفید شدہ بہن گشت و دریا دریا باریدن گرفت۔ بنائے نہ ماند کہ بہ آب نہ رسید، متاعے نہ یافتند کہ آب نہ دید۔ مردمان مانندِ آب بازان براے نجات دست و پا می زدند، امّا از شدّتِ بارش ہر لحظہ نومید تر می شدند۔

ابرِ تر از بس تر یہا می نمود
ہر یکے از خوف جانش خشک بود

پاسے بر این نہ رفتہ باشد کہ صحرا صحرا آب از دشت رو بہ شہر آوردہ اکثر آبادی را برد و بہ یک مژگان بہم زدن عماراتِ آن محلّہ برہم خورد۔ خانہا نشستند، دیوارہا شکستند۔ چوں آب را زمین فرو

برد از در و بام نشانے نہ یافتم، از بناہا آثارے نہ دیدم۔ تلاطمِ امواج و تصادمِ ہوا مکانات را بہ خاک برابر ساخت۔ کفِ دست میدانے بود کہ نگاہ بے حایلِ نشیب و فراز تا چشم کار می کرد می رفت۔ عبرت دست بہم داد کہ این قسم معمورۂ دق از دل بر در عرصۂ یک ہفتہ ہا صحرائے لق و دق شد۔

حیرانِ کار راہِ تکیۂ فقیر پیش گرفتم۔ در اثنائے راہ نگاہم بر آن پیر زنِ روغن فروش افتاد، کہ بسانِ سر نشینان پامال ذلت و خواری افتادہ پیشِ کس و ناکس رو می انداخت۔ گفتم حرفِ دیروزہ است کہ دست در روغن داشتی، پسرت جوان چربے بود، چہ واقع شد کہ دفعتاً بہ چنین بلا مبتلا شدی۔ تو خود سرِ دستے بہ ہر کس می گرفتی، چہ کردی کہ بہ جزائے آن انگشت پا شدی۔ دمِ سرد برآورد و گفت کہ اے عزیز! چگویم، تفصیل لطف نہ دارد۔ نفرینِ فقیرِ خداگیرم ساخت، آسمان روئے مرا بر خاک انداخت۔ اگر با ادبرخوری ازین خاک افتادہ بگو کہ ناکشیدنیہا کشیدم، بہ سزائے کردہ رسیدم۔ اکنون عذر مرا بپذیر، از خاکِ مذلت برگیر، دعائے کن کہ جہان آب و گل را دعا

بگویم، رحم آر که چارهٔ کار از مرگ بجویم۔ زندگانی مرگ است و مُردن زیست، یعنی طاقت ستم کشیدن نیست۔ گفتم دل جمع کن، اگر وقت مساعدت می کند به او می رسانم۔

یک تیر پرتاب رفته باشم که تیر مارے کفچه پهن کرده چون بادِ تند رسید۔ از شاه راه کناره کردم و بالا بالا به تکیه آمدم۔ دیدم که فقیر جامهٔ ببری به بَر دارد و بر پوستِ شیر نشسته است۔ هیئتِ هیبت ناکش چنان در مَن اثر کرد که پایم از پیش بدر رفت۔ هر طرف از چشمِ آتش فشان به وضعے می دید که بیننده را زهره آب می گردید۔ پرسید که از کجا می رسی۔ التماس کردم که برائے سیر خرابهٔ تازه رفته بودم و باآن زالِ ضعیفه نیز ملاقات نمودم۔ رُوے درهم کشید و گفت گپ دیگر مزن۔ مارے رفته است، کارِ او خواهد ساخت۔

پس از ساعتے خبر رسید که عجوزِ روغن فروش را مار گزید۔ چون من حیرانِ این واقعه ماندم و به رنگِ نقشِ دیوار سُخن نه راندم۔ گفت چه بخود فرو رفتهٔ۔ امشب همان مار این رو سیاه را نیز خواهد گزید۔ حیران گر شدم و گفتم این چه حالت است۔ گفتا اگر نه شنیدهٔ دمے که غضب فقیر

آتش می افروزد، خشک و تر ہر چہ در دمی اُفتد می سوزد۔ فرصتِ عمرِ من کم و حال بسیار درہم۔ دو سہ حرف بشنو، یاد گیر و برو۔

گفت کہ اے عزیز! دُنیا کاروان گاہ دل کشے است. از این جا بجز حسرت ہم راہ نہ می رود۔ حیف اوقاتِ آن عزیز کہ زود آگاہ نہ می شود۔ شیرانہ بزی و بہ کارِ گور بہ پرداز۔ وقت کہ چون آہو گرمِ رم است ضایع مساز۔ افلاطون با آن کمال غریبانہ زیستے، و زمان زمان زار گریستے۔ شاگردے پُرسید کہ سببِ گریہ ظاہر نہ می شود۔ گفتا اے نافہم! کسے کہ چون مرگ انتحالۂ در پیش داشتہ باشد چرا نہ گرید

خندہ می آیم چہ می پرسی سببِ گریہائے زارِ مرا

بدان کہ آن سرمایۂ جان کہ مقصود دلہاست آئینۂ در پیش دارد، و سرے با خویش۔ گرمِ تماشائے خود است و محوِ سراپائے خود۔ اگر بر آسمانِ ہفتم روی بے پرواست، در خاک شوی ہمان گرمِ استغنا۔ بے رنگیِ او رنگہا دارد و سازِ وحدتش آہنگ ہا۔ شفق یاد می دہد از رنگِ آتش، گُل می گوید کہ گل بہ جمالش۔ در پردۂ کثرت نوا سازی می نماید۔ از شش جہت آوازۂ او می آید۔ حرفِ مرگ می گفتہ باش،

بہ گورستان می رفتہ باش، تا از رفتنِ خود غافل نہ شوی و بہ لعبِ طفلانہ مائل نہ گردی۔ برو شام است و راہ پُر گِل، مرا تشویشِ رفتنے در دل۔ اُمّید کہ صبح بر جنازۂ من بیائی، حقّ صحبتِ دیرین فراموش نہ نمائی۔ مجالِ تکرار نہ یافتم، نومید بہ خانہ آمدم۔ از فرطِ غم ہیچ نہ خوردم، شب در تلواسہ بسر بُردم۔

ہنوز خیط الاسود از کنارۂ دار بستِ سبزِ فلک، کہ چندین ہزار مارِ موی زک سرِ خود را از آن نمایان دارند، فرو نہ ہشتہ بود، شورے برخاست کہ شیر آہو خانہ را مار گزیدہ ہلاک گردید۔ دل از جا رفت طاقت از پا رفت۔ اسپ از خانۂ آشنائے طلبیدم، عنانِ دل از دست دادہ رسیدم۔ خمِ جان گزا بود گداز گشتم، اشک ریزان شریکِ نماز گشتم۔ جنازہ کشان کہ خدایان شدند، دو خوانندہ نمایان شدند این بیت را سرودند بے طاقت تر نمودند

ہم رہِ نعشم بیا تا بہ سرِ تُربتم
با تو غنیمت بود یک دو سہ گامے دگر

گریان گریان مردۂ او را بُردند و بہ خرابۂ تازہ بہ خاک سپردند۔ چہ نویسم کہ از مرگِ فقیر چہ قدر ملالت کشیدم و از مار گیریِ ارقمِ روزگار

چہ حالت۔ ماہ ہا سینۂ من تفت، سال ہا از خاطر نہ رفت۔

حکایت ۲

شنیدم کہ در خرابۂ ممتاز گنج کہ محلّہ ایست از اکبر آباد درویشے داغ سودا بر سر، موے ژولیدہ تا کمر، از دور چون تیرِ خاکی گرد می کند و از بس وحشت چون شکار دور گردد۔ گاہ بہ چشم می آید و گاہ پنہان می گردد۔ مشتاق شدہ اندازِ دیدنش کردم۔ اتفاقاً ہمہ روز راہ او از ویرانہ بہ بازارِ محلّۂ مذکور افتادہ بود۔ دیدم کہ چون گرد بادِ وحشت آمادہ می رسد و بازاریان دیوانۂ بے سر و پایش قرار دادہ سنگ باران می نمایند۔ او می گوید کہ چوبِ شما در آب است۔ مبادا کہ آسیبے بما برسد و این محلّہ پاک بہ سوزد۔

چون بحث بہ طول کشید، سنگے بہ دوشش رسید۔ پرکالۂ آتشے از ہَوا در انبارِ پنبہ اُفتاد۔ شعلۂ برخاستہ بہن شد و سر بہ بازار نہاد۔ یک دم ہنگامۂ آتش چنان گرمی پذیرفت کہ دست و دلِ بازاریان سرد شد۔ یعنی آن قدر آب کہ این آتشِ تیز را فرو نہ شاند، بہم نہ رسید۔

سنگ و چوب و خشت و غلّہ ہمہ خاکستر گردید ۔ خورد و کلان در فکر خویش اُفتاد۔ فقیر در این فرصت قدم کشاد ۔

باندک زمانے بر لبِ دریا آمد و نشست ۔ دریا طرفہ دریائے بہ جوے خود بست ۔ ہر دو پا در آب در آویخت، دریائے بہ دریا بر آمیخت۔ من کہ پا بپا دویدہ آمدہ بودم، پیش رفتم و روے خود نمودم ۔ دید و نہ پرسید ۔ متفحصِ نام شدم بہ جرأتِ تمام ۔ گفتا احسن اللہ ولقب رام ۔ گفتم وطن ؟ گفتا دکن ۔ گفتم چہ پیش آمد کہ این جا رسیدی ؟ گفتا ہمین آوارگی ہا کہ دیدی ۔ گفتم دست و دہنِ گرد آلود بشو و با من اندکے واضح تر بگو ۔

چون سماجتِ من نظر کرد، ناچار حرف سر کرد، کہ اے عزیز! جوانی بود، شور در سر داشتم ۔ شبے از خانہ پا بیرون گزاشتم ۔ قلندرے جگر کبابے در بازار کمر سیخ کردہ بہ نظر در آمد ۔ شیرِ قلابِ سمین خود را کہ بر پنجۂ او از اتفاقات شکستے رسیدہ بود، بہ دوکانِ زرگر درست می کنانید ۔ سبحہ در دست داشت، متصل می گرداند و بہ حسرتِ تمام این تسبیح را می خواند، کہ سُبْحَانَ مَنْ لَیْسَ لِلْخَلْقِ اِلٰی مَعْرِفَتِہٖ

سَبِیل" بسیار بہ دلم خورد ۔ دست در گریبان زدہ از شہر برآمدم،
و چون غبار سراسیمہ بہ دامنِ کوہے در آمدم ۔ چندے در آن سنگلاخ
سخت خوردم، دندان بر جگر افشردم، غذا برگِ تر کردم، بہ ہمیں سر
بسر کردم ۔ روز و شب زار نالیدم، روے بر خاک مالیدم، حرف
نہ گفتن گرفتم، ترکِ خفتن گرفتم ۔ دیوانہ وار گشتم، یعنی بسیار
گشتم ۔ سر را بر ہر سنگ زدم، صد مردہ فرہاد شدم ۔
یکے بعد از نماز صبح این روسیاہ جلگی قبح بر تختۂ سنگے
نشستہ برسبیل نہ پا برگِ درختانِ سبز را می خورد ۔ ناگاہ سیاحت
پیشۂ سرتاپا اندیشۂ، در راہِ خدا خود گم، ریشش جو و گندم، چپکن
در بر، چتر طاؤس بر سر، از جانبِ دستِ راست پیدا شدہ گفت
کہ نہ داران تنہا نہ بندی نہ می کنند ۔ از تنک روئی جواب نہ دادم،
بر تختۂ سنگ جا کشادم ۔ دو سہ برگ تناول نمود، لحظۂ آسود و
فرمود کہ "اے عزیز! مگر دل دادۂ آن یارِ پریشان اختلاطی کہ جاے
او در ہر دل پیدا است، وارفتۂ آن قیامت خرامی کہ سراسر
براے خویش است و بیشِ خود برپا ۔ آن سرمایۂ نازِ رنگین رفتنے

دارد کہ از طرزِ رفتارش چمن چمن جان می بارد ۔ استغنائیش بہ حدیست
کہ اگر از بادِ دامن بلندش جہانے برباد رود پروا نہ دارد ۔ در جائے
کہ بہ خس پہلو می دہد محیطِ اعظم را کے رو می دہد " یارِ ما آن دارد و
این نیز ہم "۔ از لب ہائے شکر نیش بہ سبب تلخیِ ناکامی دل زدہ
نہ باید شد، کہ نومیدی را دوست نہ می دارد ۔ آن پرکالۂ آتش یعنی
تجلیِ جلوۂ من در نے لبتِ چنین عاشق قدم نہ می گزارد ۔ نومیدی
از برائے چہ؟ مقصود ہم کنار است ۔ دل تنگ چرا نشستۂ؟
کہ عالم ہمہ یار است ۔ برخیز و سیاحت کن، خوش باش و فرغت
کن "۔ برخاستم ہم راہ شدم، آگاہے بود، آگاہ شدم ۔

روزے در نواج گوالیار تکیۂ فقیرے را منزل نمودیم، و
درمیانِ ہر دو صبح مشغول بر کعتِ منفردۂ وِتر بودیم ۔ ناگاہ طوطیِ قفسی
کہ زبان دادۂ صاحبِ آن مکان بود، دو سہ بار "سُبحَانَ اللہ"
بہ حزنِ تمام گفت ۔ غیرتِ عشق در من حالتے نہ گزاشت، ہوش
از سرم دستِ لطف برداشت ۔ سیّاح آب بر چہرہ ام زد ۔ طاقتِ
رفتہ باز آمد ۔ گفت چہ بود؟ گفتم ذکر کردنِ طوطی بر دماغم خورد، غیرتِ

عشق از جانم برد ۔ گفتا آن محبوب را نیز به عاشق ہمیں معاملت
است ۔ اگر او را مشغول بغیر می بیند با این به دل نزدیکی دوری
می گزیند ۔ فتنه با پیمانے او بر سرش می دود ۔ نے نے بلکه تا کشتن
ہم راہ می شود ۔

درویشے از کلبۂ تاریکِ خود گاہے بدر نہ می آمد ۔ روزے
معتقدے گفت کہ شب ہائے ماہ در سوادِ این شہر مہتاب خوب می
شود ۔ اگر چشم آب دادہ آید خالی از کیفیت نیست ۔ آن مستِ
شرابِ معرفت تکلیفِ او را بر خاک نینداختہ رفت ۔ ہنوز چشم وا
نہ کردہ بود کہ ترکے خنجر کشیدۂ در دست رسید، و پرسید کہ فلاں کس
توئی ؟ گفت بلے ۔ گفتا ترا مستجاب الدعواۃ می گویند ۔ غلام من خورجینِ
پُر از زر گرفتہ گریختہ است ۔ دعائے کُن کہ پیدا شود، ورنہ می ستیزم
و خونت می ریزم ۔ درویش از تہِ کار باخبر بود ۔ دانست کہ آن ہمہ
ناز و عتاب را کہ ہر دم از خود حساب دارد، و بے یادِ چہرۂ مہتابیِ خود
نشستنِ من در مہتاب خوش نیامد ۔ بسیار متنبہ شد و باآن ترک گفت
کہ پیشتر از صبح صادق برلبِ دریا برو ۔ سفینۂ کہ اوّل بآب اندازند

برو سوار شو۔ انشاءاللہ بہ مراد خواہی رسید۔ ترک رفت و ہم چنین کرد۔ غلام را مع زر در ہمان کشتی یافت۔ درویش از آن باز برنیامد۔ ترکِ ملاقات کرد، تا آن کہ مرگِ طبیعیش رسید و وفات کرد۔

ہر گاہ قصدِ بیشتر کردم سیّاح پیش آمد و گفت کہ من قلّاش با این افتادگی پس از خرابیِ بسیار چون تو دولتے را از صحرا یافتم۔ حیف است کہ از دست دہم۔ امّا ازین جا دہ پانزدہ کردہ قصبہ ایست مشہور بہ باڑی، قدم گاہِ پیرِ من آن جاست۔ اگر برائے چند روز دل دہی، رفتہ چراغ افروزم و سعادتِ دارین اندوزم۔ گفتم خدا ہم راہ۔ او بآن طرف حرکت کرد و من در خرابۂ گردِ این شہر آمدہ ساکن شدم۔ مدتِ دہ ماہ بہ تنہائی بسر بُردم۔ امروز از وحشت رو بہ شہر آوردم۔ عوام کالانعام این جا تشنۂ خون شدند۔ لنگر از کف دادہ بہ دریا رسیدم۔ اکنون دل بہ دریا افگندہ منتظرِ اشارۂ آن طرف نشستہ ام۔ چون شام خندید مشغولِ نماز گردید۔

دمِ صبح باز بہ خدمتِ او رسیدم۔ دیدم کہ بہ ہمان طور نشستہ است۔ طعام با خود داشتم، پیشش گزاشتم۔ دو سہ لقمہ خورد و دست برد۔

گفتم طشت و آفتابہ حاضر است و غلام موجود۔ گفتا من درویشم، مرا دربند این ہا نباید بود۔ مگر گفتۂ مولانا کاتبی بہ کاغذے ندیدۂ

درقصرِ لاجوردی خطّیست برکتابہ — کاے بے زران چہ حاصل از گنج در خرابہ

پایانِ کار باید از جملہ دست شستن — گرماہ طشت داری ور مہر آفتابہ

گفتم بوریائے برائے فرش آوردہ ام۔ گفت من با خاک سرے دارم۔ گفتم ردائے نو بہم رساندہ ام۔ گفت این بار را بر دوش نہ می گزارم۔ گفتم کاسہ برائے آب خوردن خریدہ ام۔ گفت کاسہ بر سر شکستہ ام۔ گفتم قدرِ قلیلے برائے خرج با خود دارم۔ گفت دل بہ این نہ بستہ ام۔ گفتم چیزے ازین قبول شود۔ گفت می خواہی کہ فقیر ملول شود؟ دیگر دم نہ زدم، یعنی ساکت شدم۔

در آن زمان زنے جمیلہ چہرۂ رنگ، شوخ و شنگ، از قبیلۂ چیت سازان سبوچۂ گلی بر دوش، آفتِ صبر و ہوش، با چہرۂ آراستہ، چون سرو نو خاستہ، بہ بہانۂ آب صبح و شام ہم راہ ازدحام برلبِ دریا می آمد و خوبیِ خود می نمود۔ عالمے دیوانۂ او بود۔ بہ سر زلف حرف زنان، پشتِ چشم نازک کنان، با فقیر چہرہ شد۔ گفت کہ

اے رہ زنِ دین و دل ! این ہمہ خود را گم کردن ! برو ’رام رام‘ می گفتہ باش ۔ بہ مجردِ شنیدن لباس درید‘ خاکِ لب آب بر رو مالید‘ موے سر پیچیدین گرفت‘ ’رام‘ گویان دویدن گرفت ۔ آخر دل ہمگی خون شد‘ دہ مردہ کار جنون شد ۔ چند روز ہیچ نہ خورد‘ بہ ہمان حال جان سپرد ۔

چون این خبر رسید‘ پشتِ دست گزید ۔ گفتم این چہ رونمود ؟ گفت مقدّر چنین بود ۔ ہیچ جرمِ فقیر نیست ۔ از مقدّر گریز نیست ۔ نہ شنیدۂ کہ درویشے را آزار شد ۔ چون سخت بیمار شد‘ یعنی بیماری رو بہ تزاید آورد‘ طبیب در پرہیز مبالغہ از حد برد ۔ گفت کہ اے زیادہ ”سر از مقدّر یا از غیر مقدّر ۔ غیر مقدّر بہ من نہ خواہد رسید ۔ از مقدّر دست باز نہ خواہم کشید ۔“

دو سہ روز دیگر دیدہ شد ۔ روزے از یکے شنیدہ شد کہ آن قلندر دو سہ دنگے بہ یک دم زد و از سر دریا گل بانگ بر قدم زد ۔

حکایت ۳

دلیلِ راہِ عرفان، میان شاہ برہان، دست از دُنیا برداشتہ، قدم بہ راہِ فنا گذاشتہ، آوارہ بہ منزل رسیدہ، بہ گلیم سیہ سر درکشیدہ، سفید گو و برہنہ تن، با معنی در یک پیرہن، ہر گاہ بہ شہر آمدے سنگ بہ سنگ امی زدے۔ روزے در سوادِ شہر بہ نظر در آمد۔ دیدم چیزے کروی الشکل، بہ غایت براق، در مقدار قریبِ نیم آثار بہ دست در سایۂ درختے نشستہ ہر دمش می بیند۔ گمان بردم کہ سیمِ شاخ دار یست۔ آخر پرسیدنے کردم کہ چہ می بینی۔ گفتا بہ قولِ مرتضیٰ علی علیہ الصّلوٰۃ سیم ہم عجب چیزے ست۔ دمے کہ از دست می رود، نفعِ این برداشتہ می شود۔ گفتم تو فقیرِ سیم آوری، پروائے نہ داری این سیم دست افشار را بہ من بہ دہ۔ گفت اے خام! دست دل بر این منہ۔ سیمِ روپوش بہ کار نہ می آید۔ برائے نان پختن سیمِ خام می باید۔ گفتم ترا چہ کار؟ گفت بیا و بردار۔ چون پیش رفتم از دست گذاشت و گلیم سیاہِ خود را برداشت۔ دست بہ گلیمش زدم

به گدائی بر می خاست ۔ غیرِ فلوسے از کسے نه می خواست ۔ بده بده بر زبان راندے، این بیت اُستاد بر خواندے

آوردنِ زر بدست آسان نه بود

خوابیده به روے ہر فلوسے شیرے

یکے به نخاس که در ہندوستان جاے فروختنِ اسپان را می گویند آمد و پیش رائقے نشست ۔ اتفاقاً من نیز نشسته بودم ۔ به خاطر گزشت که مرا با این فقیر سابقه معرفتے نیست و داعیِ صحبت ہم نه دارم ۔ اگر خود به خود خدا گوئی سر کند، دانم که صاحبِ کمال مقرریست ۔ لحظهٔ بر این نه رفته بود که بر آن خطره مشرف شده سر کرد که اے عزیز! کسے را که اللہ می گویند من و تو ہمه می جویند ۔ او عجیب فتنه گریست و غریب خود سریست ۔ بجاے که پروا می کند گلِ تر بر خاک می زند، ادنیٰ و اعلیٰ را وجود نه می گزارد، مودِ ضعیف پاس دارد ۔ وقتے در مصر خشک سال اُفتاد ۔ چه دل بران که ہلاک نه شدند، چه کسان که خاک نه گشتند ۔ چون اہلِ شہر سخت خوردند التجا به ذوالنّون بردند ۔ او

کہ مشتاب، دمے این سیاہ گلیم را دریاب۔ بارے دلم نہ شکست،
خندید و بہ نشست۔ پس از دلجوئی و مزاح گوئی گفتم کہ اے پیش
دامنِ دیوانگی گردنت خردمندان، و اے دنبالہ گردِ نمد موئیت مشکین
کمندان! امروز گرد آلود از کجا آمدہ بودی؟ گفت 'من اللہ'۔ گفتم کجا
خواہی رفت؟ گفت 'الی اللہ'۔ گفتم بہ چہ سرمایہ در صحرا بسر می بری؟
گفت سرمایۂ دُنیا و آخرتِ چون منِ بے سر و پا غیرِ اللہ کہ می تواند
شد۔ گفتم ہرگاہ از دور پیدا می شوی سنگ بہ سنگ زنان می
روی، این چہ انداز است؟ گفتا سنگ بہ سنگ زدن کنایہ
از خراب کردن است۔ بدان کہ آبادیِ بیرونِ شہر ویرانہ خواہد شد
و این صحبت ہا افسانہ۔ ان چہ گفتہ بود قریب رو نمود۔

روزے شاہ مدن، قلندرِ برہنہ تن، معاصر او کہ فقیرے
بود قامت کشیدہ، درویشِ درویشان دیدہ، مردے صاحبِ حال و
با کمال، ہم رہِ دو سہ کوچک ابدال قلندرانہ بسر بردے۔ جز نانِ
جوین نہ خوردے۔ شبِ آدینہ در تکیۂ او کہ متصلِ مدار دروازہ داشت
سیم بندی می کردند۔ خلقے برائے سیرِ چراغان می رفت۔ صبحِ آن

دلِ وقت بود، توجّہ بہ باطن نمود۔ ظاہر شد کہ درین صحرا مادہ خوکے بچّہ ہا آوردہ است۔ چون ابر می آید رو بہ آسمان می نماید۔ یعنی در صورت بارش این بچّہ ہا تلف می شوند۔ اگر رئیس این جا ہمّت بر حفظ آن ہا برگمارد، ابرِ دریا بارے برخیزد و صحرا صحرا بہ بارد۔ ہرگاہ برائے پاسِ آن ہا شتافتند، از آن بلائے صعب نجات یافتند۔ ہیچ معقول است کہ برائے بچّہ ہائے خوک خوبان تلف شوند و آدمی روشان از بے آبی برباد فنا روند۔

در جائے کہ بے پروائی ہا می پردازد، خس از تری روئے سیل بہ خاک می اندازد۔ در قتلِ عام چنگیز کہ پایے کم از رستخیز نہ داشت، بہ شہر ہرات کہ صد ہزار جان دار بودند، بہ قتل رسیدند، مگر سہ کس کہ بہ گورہائے کہنہ خزیدند، یکے واعظِ مسجدِ جامع و دو کس دیگر۔ چون فوج رفت واعظ برآمد و بر منبر نشستہ سر کرد کہ امروز تنزہیہ است، واعظ با دلِ بجمع توان گفت۔ از شنیدنِ آوازِ آشنایش آن ہر دو نیز بہ مسجد در آمدند۔ بے دماغ شد و گفت کہ باز کثرت شد و تشبیہ بمیان آمد۔ دو ہمان حال غارتیان در

رسیدند و آن ہر سہ تن را بہ خاک و خون کشیدند۔

دمے کہ این بلا سر بہ آسمان کشید و بہ شیخ نجم الدین کبریٰ رسید، دامنِ قمیص بہ میان بر زدہ سنگ در دست بہ قصدِ جہاد از خانقاہ بر آمد و در میدان باستاد۔ ناگاہ ترک بچۂ خوش رو بہ شوخ چشمیِ تمام رسید و نیزۂ خطّی بر لوحِ سینہ اش زدہ گفت کہ بگیر و بمیر۔ شیخ آن نیزہ را بہ دو دست گرفتہ سخن زد کہ اے جوانِ سادۂ کین آمادہ، کلاہ ترکی بر سر، کمر زرین در کمر، سنانِ آب دار در دست، نیم ہشیار نیم مست، می دانی کہ از ترکستان می آیم، این[1] مرا نہ می شناسد۔ بلے من ترا می شناسم

اے نو بہار باغ جفا می شناسمت
داری ہزار رنگ قبا می شناسمت

او خندید و نیزہ را بہ زور از سینہ اش بر آورد۔ شیخ ہمان دم بر خاک ہلاک بیفتاد و بہ مرد۔

غرض کہ خدا طرفہ خود آراست، غریب دل بر خود نما ست۔ گردِ

---

[1] ضمیر راجع بہ شاہ مدن

راهش قیامت انگیزد، طرز خرامش بلاها ریزد۔ کارِ او هیچ به فهم در نیاید، دانش اعتراف به عجز می نماید۔ حیرانِ کار خردمند، در عجب دقّت پسند۔ او سرگرمِ کار، فکر در آزار، آگاه ناگاه، دلیل گم راه۔ ادراک و فهم این جا همه وہم۔

سخن این جا بود که قریبِ هفت هشت آثار شیرینی در گلیمِ سیاهِ خود بسته شاه برهان پیدا شد۔ قلندر آواز داد، او قدم تیز کشاد۔ این هوئے کشید۔ او گرم دوید۔ دنگے زده گفت که مگر در گلیمت سگ بچگانند۔ او انداخت و خود را به گورستان رسانیده پنهان ساخت۔ تمام روز گلیم و شیرینی در راه افتاده ماند، سگان هم نه خوردند۔ آخر به گفتهٔ اهلِ محلّه کنّاسان برداشته بُردند۔ روزِ دیگر که برهان را دیدند، حقیقت حال پرسیدند۔ گفت که او شاه و من گدا، چه نسبت میانِ من و او۔ بخیر گزشت که از زبانش این قسم برآمد۔ اگر می گفت که مثلِ سگ کجا می روی، استخوان چه می شکنی، چه می دوی، این دیوانه سگ می گردید و در خرابه بهر سو می دوید۔ از گلیمِ

ہ شاہ مدن کی گفتگو جو صفحہ ٦٣ سطر ١٠ میں 'اے عزیز' سے شروع ہوئی وہ یہاں ختم ہوئی۔

شیرینی دست افشاندم ۔ خدا خدا کردہ آدمی ماندم ۔

روزے بر سرِ بازار جزوِ بیاضے در دست نشستہ بودم کہ آن دیوانہ تمام اجزا بہ دستِ من افتاد ۔ گفت کہ در این سفینہ چیزے از حالِ نفوسِ انسانی بعدِ مفارقت بدن ہم نوشتہ اند ؟ گفتم کہ در این نسخہ رباعیات است و ابیاتِ متفرقہ ۔ گفتا کہ اگر گوش بیندازی، من بہ گویم ۔ گفتم لُطف کن ۔ گفت بدان کہ لذت دریافتنِ چیزے ملائم است و الم دریافتنِ چیزے منافی آن ۔ بر قوتے را از قوت ہا مدرکاتِ لذّت و الم است بہ حسبِ آن قوت ۔ چنان کہ لذّتِ باصرہ در دیدنِ محبوب و لذّت سامعہ در سمعِ آوازِ خوب ۔ چندان کہ مدرک عظیم تر، لذّت قوی تر ۔ و گر از اضداد است، رنج و الم زیاد است ۔ چون ہیچ مدرک شریف تر از ذات و صفاتِ واجب الوجود نیست، پس ہیچ لذّتے لذیذتر از معرفتِ او نہ باشد ۔ و قوّت ہاے جسمانی با ابدان می روند، یعنی از فنائے آن باطل می شوند ۔ قوتِ عقلی کہ لذّت و الم را می داند، بانفسِ ناطقہ باقی می ماند ۔ ادراکِ نفس متعلّق بہ بدن قاصر، و مجرّد در مشاہدۂ جمالِ او ناظر ۔ بشنو کہ نفس ناگزیر است

از دو حال، یا نقصان دارد یا کمال. کمال را نیز دو حال است، یا علوم است یا اعمال است. علمی در دلائلِ قدرتش نظر، عملی مجرّد گشتنِ نفسِ بشر. این که گفتم از قبیلِ مقالات است. نفوس را بعدِ ابدان حالات است

چون به منزل برسی راهِ دگر پیش آید
این مپندار که مُردی و سُخن کوتاه شد

اگر ساده و پاک چون نفوسِ اطفال و ابلهانست از لذّت و الم برکران ست. بر سر ساده و ناپاک جهان جهان خاک. یعنی جاذبۂ بدنش نه می گزارد و به معشوقِ اعلیٰ ربط نه دارد. شادان پاک و کامل که لذّتِ وصالش حاصل. کامل ناپاک چندے در الم یعنی با غم. این جا شوق آن جا هم. حجاب میانِ معشوق و او حایل گردد. پس از دیرے چون آن لوث زایل گردد کریم دوریِ او نه پسندد. با جواهر و عقول در پیوند. ناکامل و ناپاک همیشه الم ناک. واجب است که این جوهرِ علوی را به درجۂ عقول رسانی. تا بعدِ انقطاعِ تصرفش در الم نه مانی.

شام نزدیک بود نردبانے در راه انداخته روان شد و به گورستان

سوادِ شہر کہ در آن بسر می کرد نہان گشت ۔ شنیدم کہ ہمان شب در مہتاب از جوشِ دیوانگی چرخ زنان می گشت ۔ قضا را پایش بہ سنگِ مزارے آمد و شکست ۔ و پیش از شکستنِ شب رختِ ہستی بربست ۔ دیوانۂ عجیبے بود ذوفنون، اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون ۔

حکایت

اسدِ دیوانہ، ساکنِ ویرانہ، سالکِ مجذوب، درویشِ خوب، رندِ بوریا پوش، چون بحر در جوش، بر تالابِ فیروز خان کہ مشہور بہ آب گیرِ شکستہ بود در اشجار سر بہم آوردہ تکیہ بہ کمالِ پاکیزگی وصفا داشت ۔ اکثر رندانِ باغاتی در آفتابِ گرم آن جا رفتہ می آسودند۔ و پیشِ خدمتانِ آن دل از دُنیا برداشتہ ہمین ایشان بودند ۔ روزے شنیدم کہ در تکیۂ او بوریا کوبی است و یاران در مسجدے کہ ساختہ بود سرگرمِ پاکوبی ۔ رفتم و دیدم درمیانِ ہمہ نشستہ، زنگ و زنجیر بہ کمر بستہ، وارستۂ مستغنی الحال، نیم زبان تمامِ کمال ۔ اگرچہ در ظاہر جامہ برتن نہ داشت، امّا دامنِ پہلو دار او کس نہ می گذاشت۔ شہرے

برائے او سر بہ صحرا، او در کلبۂ احزانِ خود تنہا۔ پشت بہ کوہ بودنِ او مشہور، امّا پاسِ خاطر گاہے منظور۔ چنان چہ مرا دید و پرسید۔ چون شام شد طعام آوردند۔ دست از دُنیا شستگان باہم خوردند۔

بعدِ خوردنِ طعام جوگیے ناتھ نام تائے پیراہن در بر، زنجیرِ قلندرانہ بر سر، تاے خوان بر کفِ دست، پیشِ فقیر آمد و نشست۔ درویش چنان بہ مزاح گوئی پرداخت کہ آن ہمہ وحشت را مانوس ساخت۔ وقتے کہ سخن از ہر باب بر زبان آمد، مذکورِ حشرِ اجساد درمیان آمد۔ جوگی کہ بسیار بر مسائلِ معاد گشتہ بود، و فقیرانِ نام پہن شدہ را خدمت می نمود، سر کرد، کہ در اثباتِ بعث و حشر دلائل بسیار است۔ امّا عودِ نفس بہ ہمان بدن دشوار است۔ مثلاً مثلاً آدمی مُرد و خاکش ہمہ خورد۔ و پس از روزگارِ طویل اجزاے ارضی بہ نبات مستحیل۔ نبات غذائے حیوان شد و حیوان غذاے انسان۔ اگر ہمّت بہ حشر برگمارند بہ کدام صورت باز آرند۔ معہٰذا نفوسِ مفارقہ را غایت نیست و ابدان و مادّہ را نہایت۔ اگر حشر کنند و بہ قسمتِ مواد گرانید، نفوس از مواد البتہ بیش تر آیند۔ گفت

که هیچ ندانم، امّا این قدر می دانم که حقیقتِ جانِ آدم قدیم است به ذاتِ خویشتن و گفتگوے قالب در این جا بر قالب زدن۔ گمان مبر که معنیِ مرگ نیستیِ جانِ عزیز است۔ این انقطاع تصرّفِ او از قالبِ ناچیز است۔ معنیِ بعث و حشر نه آن باشد که جان را قالب همان باشد۔ قالب مرکبے بیش نیست، از بدل آن چه زیان است۔ ردّ و بدل با سوار است، سوار خود همان است۔ کسانے که قالبِ اوّل شرط می کنند، ترّهات می گویند و زنخ می زنند۔ برخوردِ نخست بود رخصت خواستیم۔ من و جوگی باهم برخاستیم۔

روزے اتفاق دیدنِ آن هشیار سرباز اُفتاد۔ دیدم که با همان جوگی گرمِ صحبت است۔ و می گوید که اے عزیز! دل را به دل برے داده ام که دیدنش به این نظر میسّر نه می شود، و دلِ بے قرار از بدگمانیِ بسیار هر دم به صد جا می رود۔ هر فرد از افرادِ انسانیش خداے من می گوید۔ هر بے سر و پا نشانِ او در خود می دهد۔ حیرانم که آن چه خصوصیت است۔ نه می دانم که این چه معیّت است۔ من که دل بر هلاکِ خود نهاده ام، و به این خرابی در خرابه

افتاده ام، روز و شب در تابم، هیچ در نه می یابم ـ اگر فی الجمله آگاہی داری بر خود مپیچ ـ شوق شوق است این جا و دیگر ہیچ ـ

می کُنم انچہ شوق می گوید

متعرّض بما نہ باید بود

اگر شوق در حدِّ کمال است، عاشق بہ منزلِ وصال است۔ ہر قدر در و قصور، ہمان قدر راہ دور ـ شوقِ کامل بہ کامِ دل می رساند، عاشق را معشوق می گرداند ـ کمالِ انسان معرفت است و کمالِ معرفت حیرت ـ اگر حیرانِ کمالاتِ اوئی خوشا حال، و رازِ تہ کار می گوئی عینِ وبال ـ بشنو! دُنیا را جہان گزاران می گویند، این جا دامن بہ میان بر زدہ باید بود ـ یعنی این منزل نیست راہ است ـ قافلہ قافلہ می روند ـ فکرِ زاد باید نمود

تا بہ کے گوئی ز دُنیا بگزرم

چون جرس باید سخن در راہ گفت

فقیرے ہمیشہ قصر نماز می کرد ـ شخصے گفت کہ قصر در سفر است نہ در وطن ـ گفتا ہر نفس و ہر آن از مرتبۂ خود می روم، و چوں آبِ

باریک زمان زمان تلف می شوم

جائے کہ چون نمازِ سفرِ عمر کوتہ است

بے جا بود کہ فکرِ اقامت کند کسے

یکے بعدِ نمازِ شام بہ جرأتِ تمام باو گفتم کہ اے درویش! این جگر ریش از روزے کہ بہشت و دوزخِ روحانی را شنیدہ است، خار خارے دارد، یعنی ہیچ بہ فہمید من نہ می آید۔ اگر بیان نمائی احسان بہشت کنی۔ گفت کہ اے جوان! بہشت و دوزخ کہ قالب در آن شریک است، متعارف است۔ حاصلِ یکے حور و قصور و انہار و اشجار، حاصلِ دیگرے زہر و زقّوم و نار و مار۔ امّا بہشت و دُوزخ روحانی یعنی لذّت و اَلمِ جانی، حاصلِ آن دریافت معقولات و مشاہدۂ آن ماہِ تمام، حاصلِ این شرم و خجالت و سوختگی و آلام۔ حکما می گویند نفس را بعد موت لذتِ عظیمے است کہ لب بہ وصفِ او نہ توان کشاد، یا اَلمِ الیمے است کہ شرح آن نہ توان داد۔ اشارت بہمیں

دو حال است نفوسِ کاملہ را لذّتِ دوام، ناقصہ را رنج و الم مدام

یکے بر من التفاتِ بسیار کردہ گفت کہ اے جوان! از اندازِ تو در می یابم کہ سرِ درویشی داری۔ بیا ازین خیال درگزر۔ گام اوّلینِ فقیری در ہلاکِ خود کوشیدن ست، یعنی پیشتر از مرگ طبیعی جان سپردن۔ این را جگرے می باید۔ گام دومین خود را نہ دیدن، یعنی با گزشت بسر بردن و خود را بہ چشم نیاوردن۔ این از دست کسے نہ می آید۔ قطع این دو قدم راہ مشکل است، زیرا کہ ہر نفس کار بادل است۔

روزے نشستہ بودم کہ گفت اے جوان! دوش واقعۂ دیدہ ام کہ مشعر بر واقعۂ من است۔ می بینم کہ مرا پیرِ من در بغل می کشد، و شکایتِ جدائی می کند۔ غالب کہ حنائے عشرتِ زندگانی بر سر ناخن رسید۔ گفتم خدا ترا صد سال سلامت دارد۔ خواب خیال است دل برآن نہ باید نہاد۔ در ہمان ہفتہ گوش زد شد کہ بہ سرسام مبتلا گشت، و ازین جہانِ گزاران درگزشت۔ مردِ خوشے بود خداش بیامرزاد۔

حکایت ۵

ہر گاہ روزگارِ ناسازگار بدباخت و مرا از اکبرآباد آوارہ ساخت۔ رختِ خود بہ شاہ جہان آباد دہلی کشیدم۔ این جا بہ خدمتِ شریفِ میان سعید خان رسیدم۔ او مردے بود کامل، ہمہ تن دست و دل، بالا بلند، دقّت پسند، گرم جوش، سراپا ہوش، چسپان اختلاط، خوش ارتباط، وضع مربوط، حال مضبوط، دل با یار، دست در کار، قائم اللّیل، صایم النّہار، دست از دہش باز نہ داشتے، مدار بر توکّل گزاشتے، سیر چشم تمام حیا، گرسنہ دل نام خدا۔ ہر جا خستہ جانے می دید، سر زخمش می مالید۔ گوش بر صدائے گدا بودے، گوش داریِ عاجزان نمودے۔ رُو از دُنیا بر تافتہ، عارفِ قرار یافتہ، قلندرِ موثّر دم، گفت و قدم ہم رہِ ہم، چادر بر دوش، با یک ستر پوش، پا بے کفش، سر عریان، گاہے خندان، گاہے گریان۔

اکثر در مجلس ہاے شیخانِ شہر می رفت و پائیں می نشست۔ عزیزان بس کہ پاسِ او می کردند، رفتہ رفتہ صفِ نعال صدر می شد۔ با سبزانِ نو خط ربط بہم رسانیدے، در برزن و بازار چشم چرانیدے۔ پاسِ خاطرِ ہرکس می نمود۔ یک بزرگِ کوچک بود۔ شاہ و وزیر جویاے ملاقات، او بسیار کم التفات۔ طرز خاصیش دادنِ نان، دشمن و دوست ہر دو مہمان۔ بختِ بلندے داشت، امیران زر لکے می دادند و منّت بر خویش می نہادند۔ یکے چہل ہزار روپیہ از وزیر گرفت و حوضِ شکستۂ قدم شریف را کہ آب می انداخت مرمّت کرد، و زرِ بقیّہ بر فقرا و غربا و ابن السبیل قسمت۔

چون عمر بہ پنجاہ رسید، پاے بہ دامن کشید۔ ہر روز بعدِ نمازِ صبح بہ گورستان می رفت و قریب نیم روز می آمد۔ یکے دنبالش گرفتہ روان شدم۔ دیدم کہ بر سرِ ہر گور نظر بہ عبرت می کند و پیش می رود۔ ناگاہ آوازے پاے من

به گوشش رسید. رو پس کرده به خشونت گفت که اختلاطِ زیاده بر آشنائی مرا خوش نه می آید. چنان خوف بر من غالب آمد که دیگر طاقتِ برداشتن پا نه ماند. وقتے که عین شد، می بینم که چیزے به چادر خود بسته می آرد. پیش رفتم و پرسیدم که چه آورده؟ گفت قدرے شیرینی برائے عجوزِ شکسته پائے که درین محلّه به تلخ کامی تمام چون سر نشینان به خاک اُفتاده بده بده می کند فرستاده اند. بیا که او را به خورانم. رفتم و به همان حالے که گفته بود پیر زنے را بر سرِ راه معائنه کردم برابر روے او رفته گفت که بر خیز و شیرینی به خور. آن ضعیفه از مدّت مدید نامِ شیرینی نه شنیده بود تا به خوردن چه رسد. مضطربُ الحال سر از خاک برداشت. درویش همه را پیشِ رویش گزاشت. او شکم سیر خورد و بخفت. این رو به من آورد و به گفت "راحت به دل رسان که همین منزل است و بس"۔

---

۵ ضمیر راجع به میاں سعید خاں

روزے سگے در بازار از فرطِ جوع بر استخوانِ خشک دندان می زد ۔ ناگاه ریزۂ استخوان بہ جاے دندانش خلید و خون بر آمد ۔ چون چاشنی در بُنِ دندان اُفتاد شدّت گرسنگی فریبش داد ۔ یعنی سگ گمان بُرد کہ این خون از استخوان می آید، بہ دندان خائیدن گرفت ۔ درویش این حالت اضطراری دیدہ مضطرب شد ۔ مخنّثے در آن حال از دکانِ نان بہ نانِ شوربا گرفتہ می رفت ۔ دید و بہ او گفت دیری ست کہ من و تو ہم محلّہ ایم، امّا تا امروز حاجت روائی من نہ کردۂ ۔ اگر دست ازین نان و شوربا برداری منتہاے بے حد بر من گزاری ۔ او از حالش خبر بود ۔ گفت بلا گردانت شوم، جان کہ در دُنیا بسیار عزیز است، اگر می خواستی مضائقہ نہ می کردم، نان و شوربا چہ چیز است ۔ حاصل کہ ازو گرفتہ پیشِ سگ بُرد و آن سگِ بے طاقت ہمگی خورد ۔ آرے کسانے کہ راہے بہ دل دارند، دلِ سگ را نیز بہ دست آرند ۔ یکے برادر گرامی قدر محمد حسین کلیم تخلّص شکایت کرد

که از بے روزگاری جامہ بر تن نہ دارم ۔ آخر من ہم از پیش دامنانم ۔ گاہے مراعات گوئے یا بہ کسے اشارۂ کہ زندہ خود بہ مانم ۔ گفتا شکوۂ مراعات بجا ست، لیکن مرا اختیار کجا ست ۔ " این دستِ من آستینِ دستِ دگر است " و این کہ می گوئی بہ کسے نہ می گوئی موقوف بر وقت بود ۔ رفت و ہمان شب بہ خواب دید کہ درویش با مرزا محمّد علی برادرِ خُسرو اسحاق خان شہید برائے نوکریِ من گفت و او قبول نمود ۔ پس از دو سہ روز نوکر چہل یا پنجاہ روپیۂ او شدہ آمد و آن معاملہ را بیان نمود ۔ گفتا اضغاثِ احلام اعتبار نہ دارد ۔ الحمد للہ کہ کام یاب شدی ۔

با آن کہ محوِ یادِ الٰہی می بود امّا ربطِ درستے بہ شعر و شاعری داشت ۔ یکے دم صبح مرا خواست ۔ چون حاضر شدم گفت کہ خفقان بہ شدّت دارم، وا شدے نہ می شود ۔ شعرہائے عاشقانہ بہ خوان کہ زار بہ گریم ۔ اتفاقاً این شعر از زبان من بر آمد

مبر بہ پیشِ دلِ نو شکیبِ من نامش   کہ از برائے تپیدن بہانہ می طلبد

دست بر دل نہاد و غش کرد۔ مردمان بہ دو دستش برداشتہ اندرون خانہ بردند۔ از آن باز بیرون نیامد۔ دو سہ روز حالِ عجبے داشت، گاہے غش و گاہے افاقت۔ آخر در گزشت۔ خدائے کریمش بیامرزاد و غریقِ بحرِ رحمت گرداناد۔

بحمدہ و شکرہ کہ رسالہ مسمیٰ بہ **فیض میر** تمام شُد۔ اُمید از یارانِ زبان آن ست کہ اگر جائے عیب و خطا ملاحظہ نمایند، نظر بر وقتِ تنگ و فرصتِ کم من نمودہ زبان را بہ طعن نہ کشایند۔ چہ شد کہ آہوانِ معانی را در پیمؔ اَمّا برہ بندِ این کارِ دشوار نیم۔

فرہنگ فیضِ میر

فیضِ میر کے مصنف میر محمد تقی میرؔ اردو کے بے نظیر شاعر تو تھے ہی فارسی زبان پر بھی اُن کو غیر معمولی عبور اور فارسی الفاظ و محاورات کے استعمال کی بڑی قدرت حاصل تھی انھوں نے اس چھوٹی سی کتاب میں فارسی محاورات کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ یہ محاورے بیشتر ایسے ہیں جو کلاسیکی فارسی میں مستعمل تھے، مگر جدید فارسی میں تقریباً سبھی متروک ہو چکے ہیں اور فارسی زبان کا کوئی ایسا جامع لغت موجود نہیں ہے جس کی مدد سے اِن سب محاوروں کا مطلب سمجھ لیا جائے۔ اس لئے کافی محنت اور تلاش سے مشکل لفظوں اور محاوروں کی یہ فرہنگ تیار کر کے کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں شامل کی جا رہی ہے۔

بعض محاورے اس کتاب میں ایسے ہیں جن کے لغوی اور مرادی معنوں میں بظاہر کوئی ربط معلوم نہیں ہوتا۔ اس سے یہ شبہہ کیا جا سکتا ہے کہ سیاقِ کلام پر نظر کر کے ان کے معنی اندازے سے لکھ دیے گئے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر لفظ اور ہر محاورے کے معنی فارسی لغات و محاورات کی مستند اور بعض کمیاب قلمی کتابوں سے اخذ کئے گئے ہیں۔ ان کتابوں کے نام ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) برہانِ قاطع۔ محمد حسین برہان۔ (۲) سراج اللغت۔ سراج الدین علی خاں آرزوؔ
(۳) چراغِ ہدایت۔ سراج الدین علی خاں آرزوؔ۔ (۴) بہارِ عجم۔ ٹیک چند بہارؔ
(۵) مصطلحات الشعرا۔ سیالکوٹی مل وارستہ۔ (۶) حل بے نظیر۔ محمد طالب حق
(۷) غیاث اللغات۔ غیاث الدین رامپوری۔ (۸) آصف اللغات۔ نواب عزیز جنگ
(۹) فارسی۔ انگریزی ڈکشنری F. STEINGASS
(۱۰) فارسی، عربی، انگریزی ڈکشنری۔ FRANCIS JOHNSON

سیّد مسعود حسن رضوی ادیب

تمہید

صفحہ ۴۴

جریدہ = دفتر
تحیّات = درود سلام
زاکیات = جمع زاکی۔ پاک
حرف منفصل = علیحدہ علیحدہ حروف
جو بچّوں کو سکھانے کیلئے لکھ دئے جاتے ہیں۔
آشنا بحرف منفصل نہ بود = جو حرف شناس
بھی نہ تھا۔
سر بجہان معنی نہاد = حقیقت کی دنیا میں
آرام کیا۔
ترسّل = انشا۔ مختلف خطوں میں لکھی ہوئی
نظموں اور نثر کی عبارتوں کا مجموعہ جس سے
مدرسے کے بچّوں کو ہر طرح کی تحریریں اور
عبارتیں پڑھنے اور سمجھنے کی مشق ہو جائے

حکایت اوّل

با درویشے... بر خوردم = ایک درویش
سے ملاقات ہوئی۔

صفحہ ۴۵

ایں ہمہ پریشان حالی = تو اس قدر
پریشان حال ہے۔
آں سراپا ناز = مراد معشوق حقیقی۔ خدا
تنزّہ و تقدس = علیحدگی اور پاکیزگی
پیدا نیست = ظاہر نہیں ہے۔
بخود فرو رو = اپنے اندر اتر جا۔ اپنی
معرفت حاصل کر۔
بروگرد می آمدند = اس کے پاس جمع
ہو جاتے تھے۔
شکر خام = خالص شکر
آب در شیر نمی کرد = دودھ میں پانی
نہیں ملاتا تھا۔ مراد کسی کو فریب نہیں
دیتا تھا۔
نانِ جوان = تازی روٹی

صفحہ ۴۶

نان می گویم و جان می دہم = روٹی کہتا ہوں اور
جان دیتا ہوں۔ روٹی کے نام پر جان دیتا ہوں
انتہائی افلاس کی طرف اشارہ۔

سماط = دسترخوان
نان گرم به رابه تیرمی زنم = تلی کی روٹی پر تیر نہیں لگاتا ہوں ۔ مراد حریص نہیں ہوں
آب بر دست چوں تو درویش ریختن = تیرے سے درویش کے ہاتھ پر پانی ڈالنا یعنی ہاتھ دُھلانا ۔ مراد خدمت کرنا ۔
نان پختن = روٹی پکانا ۔ مراد مقصد حاصل ہونا ۔
نان بخون ترشدن = روٹی خون میں تر ہونا ۔ مراد محروم رہنا ۔ کوئی فائدہ نہ اُٹھانا
نان بر روغن اُفتادن = روٹی گھی میں پڑنا ۔ مراد مقصد پورا ہونا ۔ مراد بر آنا ۔
نان بخون ترشدن ایں جا نان بر روغن افتادن (است) = اس جگہ محروم رہنا ہی مراد بر آنا ہے ۔
کہنہ دا ہے = ایک بوڑھی خادمہ ۔
غلط دا نغلطی کرد = کروٹیں بدل رہی تھی
مُردہ شو = مُردوں کو نہلانے والا ۔
مُردہ شو بُردہ = جس کو مُردہ شو اُٹھالے گئے ہوں ۔ یہ نفرین کا کلمہ ہے جس سے سخت ناراضی کا اظہار مقصود ہوتا ہے ۔

دکیدن = بڑبڑانا ۔
عَفعَف = کتے کے بھونکنے کی آواز ۔
مادہ سگے عفعفے کردہ است = ایک کتیا بھونکی ہے ۔ اشارہ ہے خادمہ کے بڑبڑانے کی طرف
ایں معنی = یہ بات
عجوز = بڑھیا ۔
چرب زبانی بکار می برد = خوشامد کی باتیں کیا کرتی تھی ۔
پارۂ نانے دم آبے = ایک ٹکڑا روٹی ایک گھونٹ پانی
سالخوردہ = بڈھی ۔
بسر وقتِ او افتاد = عین وقت پر اس کے پاس پہنچ گئی ۔

صفحہ ۷۴

از ہر کہ ایں راز بر روے روز افتاد = جس سے یہ راز سب پر ظاہر ہو گیا ۔
بخیہ بر چہرہ رفت = راز کھل گیا ۔
پسر او را خون بگیرد = اس کا لڑکا مارا ڈالا جائے ۔
ایں جا دیار نہ ماند = یہاں کوئی نہ رہے گا

غیرت وادی = بالکل ویران
مار بہ عصا راہ رود = سانپ لاٹھی پکڑ کے راستہ چلے۔ یعنی دشوار گزار راہ طے کرے
ازیں سر تا بہ آں سر = اِس سرے سے اُس سرے تک
ایں جا قو نہ پرد = یہاں کوئی چڑیا تک نہ اُڑے، یہ جگہ دہشت ناک ہو جائے۔
"قو" ایک چڑیا۔
دست و دہن بہ آب کشید = ہاتھ، منہ دھویا۔
نماز دیگر = عصر کی نماز۔ (نماز پیشین۔ ظہر کی نماز)
با من سر کرد = مجھ سے کہنے لگا۔
بار بندد = سامان باندھے۔ رخصت ہو جائے
مرا دل داد = مجھ کو تسلی دی۔
پردۂ ظلام فروہشت = تاریکی کا پردہ ڈالا
بہ سر ہنگیٔ تمام = بڑی سرکشی یا شورہ پشتی کے ساتھ

صفحہ ۴۸

خون گرفتہ = اجل گرفتہ۔ جس کی موت قریب ہو۔

غرور را بر روے آنہا کشید = غرور کو اُن کے سامنے کر دیا۔ یعنی اُن کا مقابلہ کیا۔
تیغِ آبگیری کردہ = آب دی ہوئی تلوار، تیز تلوار۔
بخاطر جمع = اطمینان کے ساتھ
غُربا = پردیسی اجنبی لوگ
کار بہ تمامی کشید = کام پورا ہو گیا۔
دلِ شب = آدھی رات۔
گل تمکل = شور و غل۔ بکِ بک۔
شب گرد = چور۔ ڈاکو
بدر زدند = نکل گئے۔ بھاگ گئے۔
سفید شدہ ہیں گشت = نمودار ہوکر پھیل گیا۔
بنائے نماند کہ بہ آب نرسید = کوئی عمارت نہیں رہی جو تباہ نہ ہو گئی ہو۔
متاعے نیافتند کہ آب نہ دید = کوئی چیز ایسی نہ ملی جو خراب نہ ہو گئی ہو۔
آب باز = تیراک۔ پیراک
پاسے = یک پاس۔ ایک پہر
مژگاں بہم زدن = پلک جھپکانا۔
محلہ برہم خوردہ = محلہ تباہ ہو گیا۔

فرد بُرد = نگل گئی، پی گئی، جذب کر لیا

صفحہ ۴۹

معمورہ = بہت آباد جگہ۔ آبادی۔

دق = کوٹنا، پیسنا

دق از دل بر = دل سے کوفت دور کرنے والا۔ خوش آیند۔

سر نشینان = سرِ راہ بیٹھنے والے۔ بے خانماں

رو می انداخت = عاجزی کرتی تھی۔ گڑگڑاتی تھی۔

حرف دی روزہ است = کل کی بات ہو۔

دست در روغن داشتی = تیرا ہاتھ گھی میں تھا۔ مراد خوشحال تھی۔ عیش و آرام حاصل تھا

جوان چرب = چکنا چوڑا جوان

سرِ دستے بہر کس می گرفتی = ہر شخص کی مدد کرتی تھی۔

انگشترِ پا = پیر کی اُنگلی کا چھلا۔ حقیر اور بے وقعت چیز

خدا گیر = غضب الٰہی یا بلائے آسمانی میں گرفتار۔

روے مرا بر خاک انداخت = مراد مجھ کو بے آبرو کر دیا۔

اگر باو برخوری = اگر اس سے تیری ملاقات ہو۔

جہاں ... را دعا گویم = دنیا کو دُعا کہوں، سلام کروں، دُنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ مر جاؤں۔

صفحہ ۵۰

یک تیر پرتاب = ایک تیر کے پلّے پر

تیر مار = ایک قسم کا زہریلا سانپ جو جھپٹ کر کاٹتا

کفچہ پہن کردہ = پھن پھیلائے ہوئے

بالا بالا = اصل راستے سے ہٹ کر

جامۂ ببری = ایسا کپڑا جس پر شیر کی کھال کے سے نقش بنے ہوں۔

بہ بر دارد = جسم پر رکھتا ہے۔ پہنے ہوئے ہے۔

پایم از تپش بدر رفت = مراد، میں پریشان ہو گیا۔

خرابۂ تازہ = نیا ویرانہ۔

روے در ہم کشید۔ بے دماغ ہوا۔

جز بر ہوا، چہرے سے ناگواری ظاہر ہوئی۔
گپ دیگر مزن = بس زیادہ گپ نہ مارو۔
بے اصل باتیں نہ کہو۔
کار او خواہد ساخت = اس کا کام تمام
کر دے گا۔
چہ بخود فرو رفتہ = اپنے آپ میں کیوں ڈوب
گئے ہو۔ حیرت میں کیوں پڑ گئے ہو، حیران
کیوں ہو گئے ہو۔

صفحہ ۵۱

گرم رم = تیز بھاگنے والا۔
غریبانہ = غریبوں کی طرح۔
استحالہ = تبدیلِ حالت
آن سرمایۂ جان = وہ محبوبِ حقیقی
آئینہ در پیش دارد = آئینہ سامنے رکھتا ہے
اپنے ہی کو دیکھتا ہے۔ اپنے آپ میں محو ہے۔
سرے با خویش (دارد) = اپنا ہی خیال رکھتا ہے۔
وَر = وَار۔ وَاگر۔ اور اگر
رنگ آلی = سرخی مائل رنگ
گل بہ جامش = کلمۂ تحسین۔ سبحان اللہ
واہ واہ۔

صفحہ ۵۲

لَعبِ طفلانہ = بچگانہ کھیل۔ بچوں کا کھیل
تلواسہ = اضطراب۔ بے چینی
خیطُ الاسْوَد = کالا تاگا۔ مراد سیاہیٔ شب
دار بست = ٹٹّی کی چھت جس پر انگور وغیرہ
کی بیل پھیلتی ہے اور خوشے نکلتے ہیں۔
مار مویزک = ایک قسم کا سانپ جو مٹّی
میں چھپ جاتا ہے اور صرف اپنا سر جو
مویز یعنی منقّے کی مانند ہوتا ہے، باہر نکالے
رہتا ہے۔ جب کوئی منقّے کے دھوکے اسکو
چھوتا ہے تو وہ اس کو کاٹ لیتا ہے۔ داربست
فلک کی مناسبت سے تاروں کو مار مویزک
قرار دیا ہے۔
دل از جا رفت = دل ٹھکانے نہیں رہا۔
عنانِ دل از دست دادہ = دل کی
باگ ہاتھ سے دے کر۔ مراد بے قابو ہوکر
گداز گشتم = میں مغموم ہوا۔
جنازہ کشاں = جنازہ اٹھانے والے۔
کدخدایاں = معزز لوگ۔
خوانندہ = گانے والے۔ خوش الحانی
سے پڑھنے والے۔

مار گیری = مکاری - فریب - دھوکا۔
اَز خمِ روزگار = زمانے کا چت کُھلا یعنی دور نگا سانپ۔

صفحہ ۵۳

ما بہا سینہ من تفت = ہمیں ان سے میرا سینہ جلا گیا

حکایت دوم

تیر خاکی = تیر جس کا پیکان ہڈی کا ہوتا ہے اور بہت دور تک جاتا ہے۔
گرد می کند = ظاہر ہوتا ہے۔ نمودار ہوتا ہے
دور کردہ = دور کرنے والا
انداز دیدنش کردم = اس کو دیکھنے کا ارادہ کیا۔
گردباد = بگولا۔
چوب شما در آب است = تم کو سزا ملنے والی ہے۔ سزا دینے کے لئے چھڑیاں پانی میں بھگو رکھی جاتی تھیں تاکہ مارنے میں ٹوٹ نہ جائیں۔
مبادا آسیبے بہ مارسد = ایسا نہ ہو کہ مجھ کو چوٹ لگ جائے۔
پاک بسوزد = بالکل جل جائے۔
پرکالۂ آتش = آگ کی چنگاری۔

شعلہ بر خاستہ پہن شد = شعلہ اُٹھ کر پھیل گیا۔
سر بہ بازار نہاد = بازار کی طرف چلا۔

صفحہ ۵۴

قدم کشاد = چلا گیا۔ چل دیا۔
دریا بجوئے خود بستن = چلتی پھرتی چیز کو روک رکھنا۔
دریا طرفہ دریائے بہ جوئے خود بست = دریائے اس عجیب جہاں گرد درویش کو روک لیا یعنی وہ درویش دریا کے کنارے ٹھہر گیا۔
پابہ پا = پاؤں پاؤں۔ پیدل۔
حرف سر کرد = گفتگو شروع کی۔
کمر سیخ کردہ = کمر سیدھی کئے ہوئے۔
شیر قلاب = قلندروں کی پیٹی کا بکسوا جو اکثر شیر کی شکل کا ہوتا ہے۔
سُبحہ = تسبیح۔ سین پر پیش ہے۔ زبر سے پڑھنا غلط ہے۔
سُبْحَانَ مَنْ لَیْسَ لِلْخَلْقِ اِلٰی مَعْرِفَتِہٖ سَبِیْلٌ = پاک ہے وہ ذات جس کی معرفت کی طرف خلق کے لئے کوئی راستہ نہیں۔

صفحہ ۵۵

بسیار بہ دلم خورد = میرے دل پر بہت اثر ہوا۔

دست در گریبان زدہ = گریبان پھاڑ کر

سنگلاخ = پتھریلی جگہ۔ پہاڑی جگہ۔

بسخت خوردم = بڑی زحمت اٹھائی

دنداں بر جگر افشردم = مکروہات کو برداشت کیا

بہ ہمیں سر بسر کردم = اسی طرح بسر کی۔

روے بر خاک مالیدم = انتہائی عاجزی و انکسار برتا۔ خود کو بہت حقیر و ذلیل کیا۔

ہمہ مردہ فریاد شدم = میں سو آدمیوں کی فریاد ہو گیا۔ میری حالت پر بہت لوگ افسوس کرنے لگے۔

تبریا = ناشتا۔

بر سبیل تبریا = ناشتے کے طور پر۔

ریشش جو و گندم = اس کی داڑھی کھچڑی تھی، یعنی کچھ بال سیاہ اور کچھ سفید تھے۔

چتر طاؤس = مور کے پروں کا چتر۔

نہ داران = باوقار لوگ۔

تنہا نہ بندی نمی کنند = اکیلے کچھ نہیں کھاتے ہیں۔

تنک روئی = شرمندگی۔

صفحہ ۵۶

دامنِ بلند = لمبا دامن

پہلو می دہد = مدد کرتا ہے۔

رو می دہد = التفات کرتا ہے۔

دل زدہ = مغموم۔ ناخوش۔

نے بست = ٹٹیوں سے بنا ہوا جھونپڑا

ہر دو صبح = صبح کاذب اور صبح صادق

زبان دادہ = سکھایا ہوا۔

بر دماغم خورد = میرے دماغ پر لگا۔ میرے دل پر چوٹ لگی۔

صفحہ ۵۷

باایں بہ دل نزدیکی = دل سے اتنا قریب ہونے کے باوجود۔

بدر نمی آمد = باہر نہیں نکلتا تھا۔

مہتاب = چاندنی

اگر چشم آب دادہ آید = اگر آنکھیں روشن کی جائیں۔ نظارے کا لطف حاصل کیا جائے۔

تکلیف = تجویز۔

بر خاک نیند اختہ = رد نہیں کی۔

خوا جبین = تھیلی - تھیلا۔
ننہ کار = اصل کار - حقیقتِ امر
آن ہمہ ناز و عتاب = وہ جو مجسم ناز و عتاب ہے۔ مُراد معشوقِ حقیقی خُدا۔
از خود حساب دارد = اپنے آپ پر مغرور ہے، اپنا رُتبہ پہچانتا ہے۔
چہرۂ ماہتابی = چاند کا سا چہرہ۔ روشن چہرہ۔

صفحہ ۵۸

افتادگی = ذلت۔ حقارت
کروہ = کوس
قدم گاہ = قدم رکھنے کی جگہ۔ قیام گاہ
خدا ہمراہ = خدا حافظ۔
لنگر از کف دادہ = مضطرب ہو کر گھبرا کر۔
دل بر دریا انگندہ = خطرہ کے لئے آمادہ ہو کر۔
شام خندید = شام ہنسی یعنی شام ہوئی

صفحہ ۵۹

در بند اینہا نہ باید بود = مجھ کو ان چیزوں کی فکر نہ ہونا چاہیئے۔
باخاک سرے دارم = مجھ کو خاک سے اُنس ہے۔
کاسہ بر سر شکستہ ام = کاسہ بر سر شکستن سے مراد ہے رسوا کرنا۔ یہاں لفظی معنی لئے گئے ہیں۔
چہرۂ رنگ = گلاب کا سا رنگ
چیت سازاں = چھینٹ بنانے والے کپڑے چھاپنے والے۔
بہ سر زلف حرف زناں = مُراد بے پروائی سے۔ ناز و تبختر کرتی ہوئی۔
پشت چشم نازک کناں = مُراد ناز و غرور سے نگاہ کرتی ہوئی۔
با فقیر چہرہ شد = فقیر کے سامنے آ گئی۔

صفحہ ۶۰

دہ مردہ = دس مردوں کے برابر یعنی بہت
پشت دست گزید = بہت افسوس کیا
زیادہ سر = اپنی حد سے بڑھنے والا۔
دنگ = نعرۂ قلندرانہ
گلبانگ بر قدم زد = تیزی سے چلا گیا

صفحہ ۶۱

حکایت سوم

سفید گو = صاف گو۔ بے پردہ بات
کہنے والا۔
دریک پیراہن = دو چیزوں کا ایک پیراہن
میں ہونا۔ مُراد بالکل قریب ہونا۔
ساتھ ہونا۔
کُرَوی الشکل = کُرے کی شکل کی گول۔
سیم شاخ دار = خالص چاندی
تو فقیر سیم آوری = تو مالدار فقیر ہو۔ فقر
کی دولت رکھتا ہو۔
سیم دست افشار = چاندی جو ہاتھ سے
دبانے سے دب جائے۔ بالکل خالص چاندی
سیم رو پوش = چاندی جس کا چہرہ چھپا ہوا
ہو۔ مُراد کھوٹی چاندی
برائے نان پختن سیم خام می باید = حصول
مقصد کے لئے خالص چاندی چاہیئے۔

صفحہ ٦٢

دمے = ذرا دیر
سیہ گلیم = بے دولت۔ بدنصیب
پیش دامن = خادم
ابدال = وہ مردانِ غیب جو درگاہ حق
کے اہل حل دعقد ہیں۔

کوچک ابدال = قلندر کے کم سن مُرید۔
آدینہ = جُمعہ
سیم بندی = شمعیں لوہے کے تاروں سے
لٹکا کر روشن کرنا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ
وہ ہوا میں مُعلّق ہیں چراغاں کرنا۔

صفحہ ٦٣

غیر مُلوسے = ایک پیسے کے سوا۔ فلوس
جمع فُلس بطور واحد مستعمل۔
رائق = آبِ جاری وصاف
دہنِ صحبت ہم نہ دارم = باتیں کرنے
کے قابل نہیں ہوں۔
خدا گوئی سرکند = خدا کے بارے میں
گفتگو کرنا شروع کر دے۔
خطرہ = اندیشہ۔
مُشرف = مطلع
سخت خوردند = تکلیفیں اُٹھائیں۔

صفحہ ٦٤

برائے پاسِ آنہا = انکی حفاظت کیلئے
تری = درشتی۔ سختی
روئے سیل بخاک می اندازد = سیلاب
کو نیچا دکھا دیتا ہے۔

پائے کم از رستخیز نداشت = قیامت سے کم درجے کا نہ تھا۔

تنزیہ = پاکیزگی۔ علیحدگی۔ خیال کی یکسوئی۔ وحدت۔

تشبیہ = مشابہت۔ مماثلت، خیال کا انتشار، کثرت۔

امیر مینائی کا ایک شعر ہے۔

نظر آتا ہے یاں تشبیہ میں تنزیہ کا عالم
تعالی اللہ کثرت میں ہے پیدا رنگ وحدت کا

حافظ محمد علی قلندر کاکوروی نے اپنی کتاب "مصباح التعرف للارباب التصوف" میں تشبیہ اور تنزیہ کا مطلب یوں بیان کیا ہے

تشبیہ = ظہور ذات حق کا مع اسمار وصفات کے مظاہر کونیہ میں بہ اعتبار تمثیل وتجلی کے حسب تقاضائے حبِ ذاتی ومقتضیاتِ اعیان"۔

تنزیہ = ذات حق کو عیوب اور نقصانات امکانیہ سے پاک جاننا اور باوجود ان اعتبارات اور ظہورات کے ذات کو ہر حال میں مجرد اور منزہ جاننا اور تعینات اور تشبیہات سے پاک سمجھنا"۔

غارتیاں = لٹیرے۔ ڈاکو۔

صفحہ ۶۵

نیزۂ خطی = سیدھا عمدہ نیزہ۔

صفحہ ۶۶

کنّاس = مہتر۔ جھاڑو دینے والا۔

صفحہ ۶۷

آن دیوانۂ تمام اجزا = کامل دیوانہ

ملائم = مناسب طبع۔ طبیعت کے موافق

مدرکات = جن چیزوں کا ادراک کیا جائے، جو محسوس کی جائیں

صفحہ ۶۸

نردبانے درراہ انداختہ = ایک سیڑھی زمین پر ڈال کر۔ مراد دل سے باتیں کرتا ہوا تاکہ راستہ آسانی سے کٹ جائے۔

صفحہ ۶۹

شکستن شب = رات ڈھلنا۔

ذوفنون = بہت سے ہُنر جاننے والا۔

اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ راجِعُون = ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف پلٹ جانے والے ہیں۔

حکایت چہارم

سر بہم آوردہ = سر ملائے ہوئے ۔ سر جوڑے ہوئے۔

رندان باغاتی = باغوں میں پھرنے والے آزاد منش لوگ۔

آفتاب گرم = تیز دھوپ

بوریاکوبی = نئی عمارت بنانے کا جشن۔

پاکوبی = رقص۔

زنگ و زنجیر بر کمر بستہ = آزاد فقیر کمر میں زنجیر اور گھنٹی باندھتے تھے۔

دامن پہلو دار = وسیع دامن جس سے سب مستفید ہو سکتے ہیں۔

صفحہ ۷۰

پُشت بہ کوہ بودن = دل مضبوط ہونا۔ اپنے آپ پر بھروسہ ہونا۔

تا = عدد

تائے پیراہن = ایک عدد کُرتہ

زنجیر قلندرانہ بر سر = قلندروں کی طرح زنجیر سر میں لپیٹے ہوئے۔

حشرِ اجساد = مُردوں کا قبر سے اُٹھانا۔

نام پہن شدہ = جن کا نام پھیل چکا ہو نام ور۔ مشہور۔

بَعثت و حشر = مُردوں کا جگانا اور اُٹھانا

نُفوس مفارقہ = الگ الگ روحیں۔

صفحہ ۷۱

قالِب = جسم

بر قالب زدن = فضول بجنا۔

تصَرُّف = دخل

تُرَّہات = سخنان باطل۔

زنخ می زنند = ہرزہ و پوچ می گویند۔

برخورد نخست = پہلی ملاقات۔

سرباز = سر کشادہ۔ ننگے سر۔

ہر فرد از افراد انسانیش = انسانی افراد میں سے ہر فرد اُس کو۔

صفحہ ۷۲

برخود پیچ = پیچ وتاب نہ کھا۔

مُتعَرِض = روکنے والا۔ دخل دینے والا۔ ٹوکنے والا۔

تہِ کار = حقیقت حال

دامن بر میان برزدہ باید بود = دامن گردانے ہوئے، کمر کسے ہوئے، مراد چلنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

زاد = سامان سفر

آبِ باریک = تھوڑا پانی

صفحہ ۷۳

خارخارے دارد = تردّد، فکر، اندیشہ

احسانِ بہشت = بہت بڑا احسان

زقّوم = دوزخ میں ایک درخت ہے، جس کے تلخ و بدذائقہ پھل دوزخیوں کی غذا ہے۔

الم الیم = شدید غم

صفحہ ۷۴

گذشت = غیر

کار با دل است = ہمّت کا کام ہے۔

واقعہ = خواب

مُشعِر = ظاہر کرنے والا۔ خبر دینے والا۔

واقعہ = موت

حنائے عشرت زندگانی بر سرِ ناخن رسید = زندگی کی خوش دلی خاتمے کے قریب پہنچی۔

صفحہ ۷۵

حکایت پنجم

بدباخت = بُرائی کی

ہمہ تن دست و دل = نہایت فیاض۔

قایم اللیل صایم النہار = رات بھر عبادت کرنے والا، دن بھر روزہ رکھنے والا۔

گرسنہ دلِ نامِ خدا = ذکرِ خدا کا مشتاق

سرِ زخمش می مالید = اس کو تسلّی دیتا تھا۔

گوشہ داری عاجزان = عاجزوں کی طرف التفات۔

گفت و قدم = قول و فعل

ہمرہ ہم = ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ

گفت و قدم ہمرہ ہم = قول و فعل میں مطابقت۔

صفحہ ۷۶

عزیزان = ذی عزت لوگ

صفِ نعال = جوتے اتارنے کی جگہ۔ آخری صف۔

صدر = سب سے بلند، سب سے زیادہ عزّت والی جگہ۔

سبزان نوخط = حسین لڑکے جن کا خط حال ہی میں نکلا ہو۔

برزن = کوچہ۔ گلی

چشم چرایندے = رغبت کی نظر سے دیکھتا تھا۔

بزرگِ کوچک = خدارسیدہ نوجوان
زر لکّے = لاکھ روپیہ
کہ آب می انداخت = جس سے پانی بہہ جاتا تھا۔
قدم شریف = عمارت جس میں ایک پتھر
پر رسول اکرمؐ کے قدم کا نشان بنا ہوا ہے۔
ابن السبیل = مسافر
قسمت (کرد) = تقسیم کر دیا۔
پا بدامن کشید = گوشہ نشین ہو گیا۔

صفحہ ۷۷

اختلاط زیادہ بر آشنائی = شناسائی سے
بڑھ کر بے تکلفی۔
مرا خوش نمی آید = مجھ کو اچھا نہیں لگتا۔
عین شد = روشنی ہوئی۔
شکستہ پا = مجبور

سر نشینان = سر راہ بیٹھنے والے۔ بے خانماں

صفحہ ۷۸

چاشنی در بن دنداں افتاد = مزہ ملا۔

صفحہ ۷۹

جامہ بر تن ندارم = مراد ضروریات زندگی
میسر نہیں ہیں۔ میرے بدن پر کوئی کپڑا نہیں ہے
پیش داماناں = خادماں عقیدتمنداں۔
زندہ خود بمانم = زندہ تو رہوں۔
اضغاثِ احلام = خوابہائے پریشاں
وا شد بے نمی شود = کوئی افاقہ نہیں ہوتا

صفحہ ۸۰

نحمدہٗ و نشکرہٗ = اس کی حمد کرتے ہیں، اور
اس کا شکر بجا لاتے ہیں۔
بڑہ بند = ماہر۔ مشاق۔